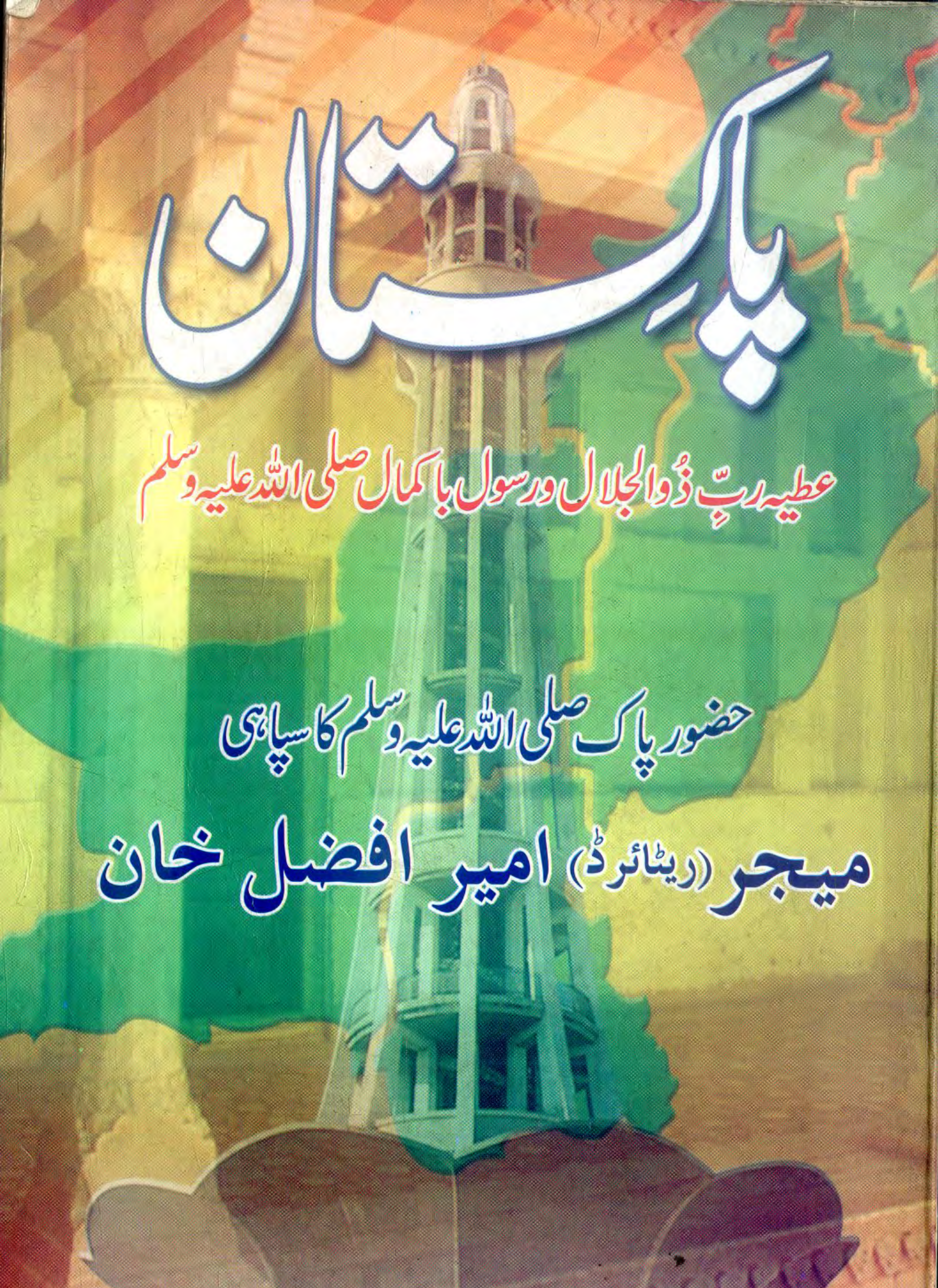


پاکستان

عطیہ ربِّ ذوالجلال ورسول باکمال صلی اللہ علیہ وسلم

حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم کا سپاہی

میجر (ریٹائرڈ) امیر افضل خان

ناشر میجر (ریٹائرڈ) امیر افضل خان صاحب راولپنڈی پاکستان

پاکستان

عطیہ ربِّ ذُوالجلال ورسول باکمال صلی اللہ علیہ وسلم

حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم کا سپاہی

میجر (ریٹائرڈ) امیر افضل خان

ناشر میجر (ریٹائرڈ) امیر افضل خان صاحب

راولپنڈی پاکستان

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

کتاب : پاکستان عطیہ رب ذوالجلال و رسول باکمال ﷺ
مصنف : حضور پاک ﷺ کا سپاہی میجر (ریٹائرڈ) امیر افضل خان صاحب
صفحات : 160
تعداد : 2000
سن اشاعت : جنوری 2006
قیمت :

ملنے کا پتہ :

1: **میجر (ریٹائرڈ) امیر افضل خان صاحب**
19۔ ذی شان کالونی قاب لائنز راولپنڈی

2: **کرنل (ریٹائرڈ) شیخ عبدالرؤف صاحب**
133۔ سی ویسٹریج نمبر 1، راولپنڈی

3: **علم دین پبلشرز**
علم دین سنٹر، ماتھر سٹریٹ، 7۔ لوئر مال روڈ لاہور

پیرانمبر	عنوانات	صفحہ نمبر
49	قرآن وسنت کی موجودگی میں مسلمان کسی دوسرے علم کے محتاج نہیں	39
50	کیا نہ ہونے سے مردہ ثقافت بہتر ہے؟	40
51	امام احمد رضا بریلویؒ کا ''پاکیزہ سہرے''	41
52	میڈیا پر ابن الوقت اور مفاد پرستوں کا قبضہ	42
53	حلال بھی بیچتا ہوں اور سؤر بھی	43
54	اسلام میں حزبِ اختلاف کی گنجائش نہیں	45
55	بے دین دانشور۔۔۔ مختلف اداروں کے تنخواہ دار	48
56	حفیظ جالندھری اور صلاح الدین کو صحیح مقام نہ دیا گیا	49
57	ضیاء الحق مودودیت نواز تھا	50
58	پاکستان میں کونسا اسلام نافذ ہو؟	50
59	حضرت علیؓ حکومت سے دور رہنا چاہتے تھے	51
60	حضرت عثمانؓ کے خلاف سازش	52
61	امیر معاویہ نے کسی شرپسند پر ہاتھ نہ ڈالا	53
62	جنگ جمل مکمل طور پر مروان کی سازش کی پیداوار ہے	54
63	حاضر وغائب امام موجود ہیں	55
64	روزنامہ جنگ اور نوائے وقت والے کس قبیل کے ہیں	56
65	علامہ شبلی، سیّد سلمان ندوی اور مودودی کا نظریہ جہاد	57
66	امیر معاویہ کا مصلحتی اسلام رائج ہو گیا	58
67	ہمارے ایک ہاتھ میں تلوار اور دوسرے میں قرآن	60
68	''وہی کھوتی اور وہی خرمیدان''	61
69	کیا سؤر تکبیر پڑھ کر گلا کاٹنے سے حلال ہو جائے گا؟	62
70	وفاقی شرعی عدالت ایک ''بے بس'' ادارہ ہے	63
71	نوائے وقت اور جنگ پر تو اس دولت کے عوض قوم کی رہنمائی فرض ہے	64
72	مجید نظامی اپنے بھائی کو شہید جمہوریت گردانتا ہے	66

صفحہ نمبر	عنوانات	پیرا نمبر

تعارف

جناب میجر (ریٹائرڈ) امیر افضل خان صاحب ایک ایسی تحقیقی شخصیت ہیں کہ جو بغیر کسی لگی لپٹی کے سیدھے سادھے لہجے میں اپنا مافی ضمیر صفحہ قرطاس پر منتقل کر دیتے ہیں۔ میجر صاحب کا اندازِ تحریر اتنا دلکش ہے کہ اگر کوئی آپ کی کسی کتاب کا مطالعہ شروع کرے تو کتاب کو ختم کر کے ہی دم لیتا ہے۔ یہ کتاب بھی آپ کے ہڈ بیتے واقعات سے مزین ہے اور انداز ایسا دلکش و دلنشیں ہے کہ کتاب شروع کرنے کے بعد جب تک ختم نہ ہو چین نہیں آتا خصوصی طور پر پیرا نمبر 102 سے 110 تک جو ستمبر 1965ء والی جنگ کی کہانی بیان کی گئی ہے اسے پڑھتے ہوئے انسان پر ایک ایسی کیفیت طاری ہو جاتی ہے کہ انسان خود کو وجدانی طور پر میدان جنگ میں تصور کرتا ہے اس کے علاوہ ''بڑوں'' کی نااہلی اور نالائقی کا پردہ چاک کرنے سے بھی میجر صاحب نے کسی قسم کا دریغ نہیں کیا اور بالکل صاف صاف الفاظ میں پالیسی سازوں کی غلط پالیسیوں اور حرص و طمع سے لبریز اندرونی کہانیوں کی روئیداد قوم کے سامنے پیش کر دی ہے تا کہ قوم کو معلوم ہو جائے کہ اوپر والے اکثر اوقات عقلِ کل ہونے کا دعویٰ کر کے کیسی کیسی لغو حرکات کا مظاہرہ کرتے ہیں اللہ تعالیٰ اپنے حبیب صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کا صدقہ مسلمانوں کے حال پر کرم فرمائے اور انہیں نیک نیت قیادت نصیب فرمائے۔ آمین بجاہ سید المرسلین علیہ الصلوٰۃ والتسلیم!

محمد طفیل عفی عنہ

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْم ہ

نَحْمَدُہٗ وَنُصَلِّی عَلٰی رَسُوْلِہِ الْکَرِیْم ہ

داستانِ عطیۂ ربّ ذوالجلال ورسُولِ پاک صلی اللّٰہ علیہ و آلہ وسلّم

بزبانِ ''حضور پاک صلی اللّٰہ علیہ و آلہ وسلّم کا سپاہی'' اور ''رفقا''

1- ملکِ پاکستان ربِ ذوالجلال اور حضور پاک صلی اللّٰہ علیہ و آلہ وسلّم کا عطیہ ہے۔ لیکن پاکستان کے وجود میں آنے اور اس کی نصف صدی کی اللہ تعالیٰ سبحانہٗ اور رسولِ پاک صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے غداری کی وجہ سے ہم نے جو ذلت کی زندگی گزاری، اس عاجز نے اس سب کہانی کو مورخہ 19 فروری 1996ء کو قوم کو ایک آدھ صفحہ کے کھلے خط کے ذریعے سے باور کرادیا تھا، جس کی ایک کاپی یہاں چسپاں کررہا ہوں۔

ا۔ ''مورخہ 19 فروری 96ء معزز قارئین! السلام علیکم۔ اللہ تعالیٰ کی رحمت سے میری بیسویں کتاب ''اسلامی نظامِ حکومت'' شائع ہو گئی ہے۔ کہ رسولِ عربی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے اسلام کا نفاذ کیسے ہو۔ ایک لحاظ سے یہ کتاب میری اُنیس کتابوں اور ہزاروں مضامین کا اختصار بھی ہے کہ پچھلے 48 سال ہم نے اللہ تعالیٰ اور رسولِ پاک صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے غداری کی وجہ سے ذلت کی زندگی گزاری اور اب گزارش ہے کہ توبہ اور ندامت کریں اور میری کتابوں میں بیان شدہ صراطِ مستقیم پر چلیں کہ اسلام میں نہ فرقہ بندی کی اجازت ہے نہ اسلام میں فقہی گروہ بندی یا سیاسی گروہ بندی کی اجازت ہے۔ مسلمان اللہ تعالیٰ کی فوج ہیں۔

ب۔ پس منظر یہ ہے، کہ لنگڑا لولا پاکستان اینگلو امریکن بلاک کی بھی ضرورت تھا کہ انیسویں صدی سے وہ لوگ سر سید اور غلام کذاب کو ایک جیسی ہدایات دے کر یہاں پر ابن الوقت اور بے دین لوگوں یا قادیانیوں اور چھپے قادیانیوں کی ایک ''کھیپ'' تیار کرتے رہے۔ جس کو وہ ہم پر ''مسلط'' کر گئے اور آج تک ''مسلط'' ہے۔ کبھی مسلم لیگ کی شکل میں، کبھی پیپلز پارٹی کے روپ میں اور کبھی مارشل لاء کے ڈنڈے کے طور پر، کہ یہاں رسولِ عربی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے اسلام کی بجائے کمال ترکی برانڈ بے دین طریقے رائج کئے جائیں اور ہم غیروں کے پروردہ رہیں۔

ج۔ علاوہ ازیں مولوی اور دینی وسیاسی جماعتیں کنویں کی ''مینڈکیاں'' ہیں۔ اسلامی فلسفہ حیات سے نابلد اور نظریہ جہاد سے ''بے خبر'' یہ لوگ نہ آزادی کے وقت، نہ آزادی کے بعد قوم کی رہنمائی کر سکے۔ پاکستان ہم نے کافرانہ سیاسی نظام کے ذریعے سے حاصل کیا۔ تو ستر ہزار عورتیں کفار کے پاس چھوڑ آئے۔ اور قادیان کے اردگرد سو میل تک مسلمانوں کا نام مٹ گیا۔

د۔ ان کافرانہ نظاموں کے ساتھ چمٹے رہنے کی وجہ سے قائدِ اعظم کی وفات کے چار دن بعد ربوہ میں جھوٹے نبی کا مرکز بنوایا۔ اور 1971ء میں نوے ہزار فوجیوں سے ہتھیار ڈلوائے۔ اگر جہاد کو طرزِ زندگی کے طور پر اپنا لیتے تو کشمیر بھی مل جاتا اور بھارت بھی ٹکڑے ٹکڑے ہو جاتا۔ محمد صلی اللہ علیہ وسلم سے وفا کے بدلے ہمیں لوح و قلم بخشے جانے والے تھے، لیکن اپنے دامان کو تنگ کر کے اپنی منزل کو روٹی، کپڑا اور مکان تک محدود کر دیا اور ملک کی تمام اخباروں خاص کر نوائے وقت نے ہمارا رخ خانہ کعبہ کی طرف نہ ہونے دیا۔

ر۔ کافرانہ جمہوری نظام نہ کنٹرول ہو سکتا ہے اور نہ ایوب اس کو کنٹرول کر سکا، نہ یہ

اسلامی ہے اور نہ ضیاء اس کو اسلامی بنا سکا۔ اسلام اللہ کی آمریت ہے اور مشورہ سے اس کو جاری کیا جاتا ہے۔ لیکن ہم نے علامہ اقبال اور قائدِ اعظم کو حضور پاک صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی نبوت میں ''شرکت'' دے دی ہے۔ اور ان صلی اللہ علیہ وسلم کی جگہ مردود سر سید کو دوقومی نظریہ کا بانی بنا دیا۔

س۔ اٹھو اور میری کتابوں میں نشانِ راہ تلاش کرو اور ان تحقیقات کو آگے بڑھاؤ جو حرفِ آخر ہرگز نہیں۔

ص۔ جنرل سیّد رفاقت کے مطابق علامہ اقبال نے بھی میجر امیر افضل کے مضمون ''داستان'' پر یہ کچھ کہا تھا:۔

اندازِ بیان اگرچہ بہت شوخ نہیں
شاید کہ اتر جائے تیرے دل میں میری بات
یا وسعت افلاک میں تکبیرِ مسلسل
یا خاک کی آغوش میں تسبیح و مناجات
وہ مذہب مردان خود آگاہ و خدا مست
یہ مذہب ملا و جمادات و نباتات

م۔ لیاقت کشمیر بھارت کو دے گیا۔ لوگوں کو اللہ کا شریک بنایا، وطن کی پوجا سکھلائی۔ ایوب ہمیں امریکہ کی گود میں بٹھا گیا۔ یحییٰ اور بھٹو نے ملک دولخت کر دیا۔ اور ضیاء نے گیارہ سال اسلام کے ساتھ فراڈ کیا۔ بے نظیر اور نواز شریف بھی امریکہ کے پروردے ہیں۔ آؤ ہم ندامت کر کے اللہ تعالیٰ کی فوج بن جائیں۔''

2۔ اس خط کا ایک ایک لفظ اسی طرح تر و تازہ ہے۔ جس طرح آج سے نو دس سال پہلے تھا۔ اور وہی پیغام دہرا رہا ہے ''کہ آؤ قوم کے طور پر توبہ و ندامت کر کے اللہ تعالیٰ کی فوج بن جائیں''

3۔ موجودہ زلزلے سے ہم جس تباہی سے دوچار ہوئے ہیں تو اس خط کے کچھ الفاظ کی زمانے کے تناظر میں نہ صرف وضاحت ضروری ہوگئی ہے بلکہ کئی عوامل اور پس مناظر کو بھی قوم کے سامنے پیش کرنا ہوگا، کہ اس خط کے ایک ایک لفظ یا ایک ایک فقرہ میں کئی کتابوں کے مضامین ''پنہاں'' ہیں۔

4۔ مثال کے طور پر خط کے دوسرے پیرا میں جو سر سید اور غلام کذاب قادیانی کے بین ''مماثلت'' کا ذکر ہے تو یہ عاجز 1993ء میں سپریم کورٹ میں نہ صرف اس سلسلہ میں متعدد ثبوت پیش کر چکا ہے، بلکہ یہ بھی ثابت کر چکا ہے کہ سر سید نے غلام کذاب سے بڑھ کر اسلام کا نقصان کیا کہ وہ ''نیچریہ'' عقیدہ کا پیروکار تھا۔ حیات بعد ممات کا قائل نہ تھا۔ جنت اور دوزخ کو ''استعارے'' کہتا تھا۔ لیکن ہم نے اس کو دوقومی نظریہ کا بانی بنا کر حضور پاک صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی نبوت میں ''شرکت'' دے دی اور اپنا ''رہنما'' بنا کر اس کے نام پر تعلیمی ادارے بنا رہے ہیں۔ اور حق اور باطل کو ایک دوسرے میں گڈمڈ کر کے فکری طور پر اسلام کو پاش پاش کر رہے ہیں۔

5۔ قادیانی یا چھپے قادیانی ہمیشہ حکومت کے کرتا دھرتا رہے۔ 1947ء میں سیالکوٹ کا ڈپٹی کمشنر غلام کذاب کا پوتا ایم ایم احمد تھا۔ اُس کی بات اتنی چلتی تھی کہ پنجاب کے انگریز گورنر سر مودی کے ساتھ مل کر اس نے پنجاب کے مجاہدین کو جموں محاذ نہ کھولنے دیا۔ اور مہاراجہ کشمیر ہری سنگھ سری نگر سے فرار ہو کر جموں پہنچ گیا۔ جہاں اس کے لئے ''حفاظت'' تھی کہ بھارت کے ساتھ الحاق پر دستخط کر دیئے۔ پھر ظفر اللہ قادیانی ہمارا وزیرِ خارجہ بن گیا۔ اور لیاقت علی، ناظم الدین اور محمد علی بوگرہ تینوں کے زمانے میں

ہمارے غیر ملکی سفارت خانوں کو قادیانیوں کے ساتھ بھر دیا گیا۔اور آج تک یہ سفارت خانے قادیانیوں کے ''گڑھ'' ہیں۔لیاقت علی کے زمانے سے ہی لاہوری قادیانی،عزیز احمد اور جی احمد ''برادران'' پاکستان کے ''بادشاہ گر'' (King Makes) بن گئے اور ذوالفقار بھٹو کے زمانے تک عزیز احمد اُس کا اہم وزیر تھا۔ضیاء الحق نے بھٹو کو تو پھانسی چڑھا لیا،لیکن عزیز احمد کی طرف اُس کو میلی آنکھ سے دیکھنے کی ''اجازت'' نہ تھی۔

6۔ بھٹو کے زمانے میں جو قادیانیوں کو ''اقلیت'' قرار دیا گیا،یہ غلط سہرا بھٹو کو باندھا جاتا ہے۔یہ بھی ایک ''قادیانی ضرورت'' تھی کہ ہم ان کو ایک ''گروہ'' تسلیم کر لیں،کہ وہ بین الاقوامی دنیا میں ''حفاظت'' کے حق دار ہو جائیں۔غلام کذاب ،ہماری غلامی کے زمانے کے ایک تاریخی حادثہ کی ''پیداوار'' ہے۔آج اگر کوئی ایسا آدمی سامنے آئے،تو ہم اس کو مرتد قرار دے کر پھانسی چڑھا دیں گے۔چنانچہ غلام کذاب کے ہر ''پیروکار'' کے لئے توبہ ہے،یا دیس نکالا،یا مرتد کی سزا۔یہ عاجز 1993ء میں سپریم کورٹ کے سامنے یہ ڈیمانڈ بھی پیش کر چکا ہے۔اور دوم کہ سلطنتِ خداداد پاکستان میں جھوٹے نبی کا ''مرکز'' نہیں ہو سکتا،اور ربوہ کو دریا برد ہونا چاہیے۔

7۔ لیکن صورتِ حال یہ ہے کہ اسلام کا لبادہ اوڑھنے والے ضیاء الحق کے بارے میں بھی کہا جاتا تھا کہ وہ چھپا قادیانی تھا اور ضیاء کو وضاحت کرنا پڑی۔اُس کے مشیرانِ خاص میں جنرل اختر عبدالرحمٰن اور جنرل کے ایم عارف کے چھپے قادیانی ہونے کے بارے میں کئی ثبوت پیش کئے جا سکتے ہیں۔اور یہ عاجز مارچ 1988ء کی اپنی مدینہ منورہ کی روحانی

واردات، کہ ضیا ''حق'' نہیں ''باطل'' ہے اور ''عبرتناک'' انجام سے دوچار ہو گا، کئی لوگوں کو بتا چکا ہے۔ کہ مارشل لاء لگانے سے پہلے وہ میرا ''چھوٹا بھائی'' بنا ہوا تھا۔ بعد میں اس صف میں نماز بھی نہ پڑھتا تھا، جس میں یہ عاجز ہوتا۔

8۔ غلام اسحٰق اور ایم ایم احمد ''گہرے دوست'' تھے۔ غلام اسحٰق کو وزیرِ اعظم کے لئے معین قریشی کا نام یہی غلام کذاب کا پوتا ایم ایم احمد دے گیا تھا۔ اور آج بھی شوکت عزیز اور طارق عزیز کے ''قادیانی رابطے'' ہر خاص وعام کی زبان پر ہیں۔

9۔ ہم کتنے ''بے خبر'' لوگ ہیں کہ خلافتِ اسلامیہ کو ختم کرنے والے یہودی کمال کو اپنا ہیرو سمجھتے رہے اور اس کو ''غازی مصطفٰے کمال پاشا'' کا خطاب دیئے ہوئے ہیں۔ غلام کذاب، سرسید، کمال ترکی، جمال عبدالناصر، یاسر عرفات، صدام حسین یا عرب نیشنلزم کے دعویدار یا بعث پارٹی والے سب اسلام دشمن طاقتوں کی ''پیداوار'' ہیں۔ اور ہمارے اس زمانے کے کئی علماء اگر سازش کی کڑی نہ بھی ہوں تو دشمن کی سازش کے ان پر ضرور اثرات ہیں۔

10۔ اقوامِ اسلام تیرھویں صدی عیسوی کے منگولوں کے حملے اور سقوطِ بغداد یا صلیبیوں کی یلغار جیسے المیوں کو تو ''برداشت'' کر گئیں لیکن اٹھارویں صدی عیسوی میں جو سازش شروع ہوئی ہے کہ ؂

''وہ فاقہ کش کہ موت سے ڈرتا نہیں ذرا
روحِ محمد ﷺ اس کے بدن سے نکال دو''

اور

''تعلیم اس کو چاہیے ترک جہاد کی
دنیا کو جس کے پنجہ خونین سے ہو خطر''

اس کے سامنے مغلوب ہو گئے ہیں۔ چنانچہ میرے 19 فروری 96ء کے خط
کے پیرا 3 میں جو "مولویوں" کے اسلامی فلسفہ حیات سے نابلد اور نظریہ جہاد
سے بے خبر ہونے کا ذکر ہے، اس وسیع مضمون کو قارئین کے سامنے کئی تناظر اور
واسطوں سے پیش کر کے تمام تر سازشوں کے تانے بانے ملانے ہوں گے۔

11۔ مثال کے طور پر اگر لارڈ ہمفرے نے اٹھارویں صدی عیسوی میں محمد بن
الوہاب کو "برین واش" کیا، تو اس برصغیر میں وہی کام اسمٰعیل دہلوی سے
کتاب "تقویۃ الایمان" لکھوا کر کیا گیا۔ کہ اس کو بمبئی کی بجائے کلکتہ
والے راستے ایک "لگژری جہاز" کے ذریعے نہ صرف حج کرایا گیا، بلکہ حجاز
میں ابن وہاب کے پیروکاروں کے ساتھ رابطہ بھی "بندھوایا" گیا۔ غیروں
کی گیم کھیلنے والے ان "مہروں" کی ایک اور "مشترکہ قدر" یہ ہے کہ
انیسویں صدی کے اختتام پر جو سرسید اور غلام کذاب سے نظریہ جہاد کو
منسوخ کرایا گیا اور ملکہ وکٹوریہ کو مسلمانوں کی خیر خواہ قرار دیا گیا۔ اس کی
بنیاد بھی انیسویں صدی کے شروع سے اسمٰعیل دہلوی سے بندھوالی گئی کہ
انگریزوں کے خلاف جہاد حرام ہے۔

12۔ اسمٰعیل دہلوی کے سکھوں کے خلاف تک جہاد کو "محدود" کرنا، راجپوتانہ
سندھ، کوئٹہ، قندھار اور کابل کے راستے ضلع ہزارہ تک سفر اور وہاں
مسلمانوں میں خانہ جنگیاں، کیا اس سب میں سکھوں کو آگے "پھیلنے" کی شہ
دینا مقصود نہ تھی۔ کہ گلاب سنگھ ڈوگرہ سکھ لشکر کو اٹک سے پشاور کی طرف اور
فتح خان ٹوانہ ماڑی انڈس سے بنوں کی طرف پیش قدمی کرا رہے تھے اور یہ
دونوں انگریزوں کے ایجنٹ تھے، کہ 1848ء میں انگریز چلیانوالہ کے
مقام پر شکست کھانے کے باوجود سکھوں پر کوہستان نمک کے اعوان قبائل

کے ''شب خون'' کی وجہ سے گجرات کے مقام پر سنبھل گئے، اور موجودہ پاکستان میں سکھ حکومت ''تسبیح کے دانوں'' کی طرح بکھر گئی۔ کون کس کی گیم کھیلتا رہا، اس کا مطالعہ، واقعات کے اثرات اور اثرات کے نتائج کی مدد سے کرنا چاہیے۔ علمی لحاظ سے اُنیسویں صدی اسلام کی بدترین صدی ہے کہ ہم نے اپنے اندر سے روحِ محمد ﷺ کو نکالنے اور جہاد کے بے جان کرنے کے فکری پہلوؤں کو ''ہذا بہتان عظیم'' کے الفاظ سے رد کیوں نہ کر دیا یا زمین میں گاڑ کیوں نہ دیا۔

13۔ اُنیسویں صدی میں عالم اسلام میں سیّد جمال الدین افغانی کے بغیر ایک دانشور بھی نظر نہیں آتا۔ اس برصغیر میں کسی علمی ادارے کا نام سننے میں نہیں آتا، سوائے صدی کے آخر میں ''سرکاری مولویوں'' کے دو اداروں کے جن کو ہم اب دیوبند اور ندوہ کے نام سے جانتے ہیں۔ انیسویں صدی کے اختتام کے دنوں میں اس برصغیر کے عظیم عالم اور صوفی پیر مہر علی شاہ رحمتہ اللہ علیہ نے جب علم حاصل کرنا چاہا، تو اپنے گاؤں گولڑہ سے سو میل دور وادیٔ سون سکیسر کے ایک گاؤں میں ایک ''فرد'' مل سکا۔ اسلامی ادارے تو وہاں بھی ''سوکھ'' چکے تھے۔ محمود غزنوی نے جوان علاقوں سے آگے اسلامی علوم کو پھیلانے کیلئے عرب النسل علوی اعوان قاریوں کو آباد کیا تھا، اورنگ زیب بادشاہ کے زمانے کے شروع ایام تک اورنگ زیب جب موجودہ تلہ گنگ کے جنوب ایک گاؤں ''کھچیاں'' سے گزرا تھا، تو پانی بھرنے والی عورتوں کی قرآن پاک کی تلاوت اس کے کانوں تک پہنچی اور دہلی میں قرآن پاک سننے کے لئے اسی گاؤں کے ایک حافظ صاحب کو ساتھ لے گیا تھا۔

14۔ لیکن انیسویں صدی میں عالمِ اسلام میں اسلام کے چشمے خشک ہو گئے۔ہم مومن کی فراست سے عاری ہو گئے۔اور اس عاجز نے اپنے علاقہ سون سکیسر میں بچپن میں جوتھوڑی سی روایتی اسلام کی جھلک دیکھی، اس کو بھی بعد میں ''مفقود'' ہوتا دیکھا۔تب ہی ہمارا مولوی تحریکِ پاکستان کو نہ سمجھ سکا۔دیو بند والوں کی مخالفت تو ''خود غرضی'' اور ''ابن الوقتی'' کی وجہ سے تھی کہ ان کی ''سلطنت'' کا بڑا حصہ ان کے کنٹرول سے ''نکل'' رہا تھا۔اور انھوں نے برہمن کی حکومت کے ''چرنوں'' میں رہنا تھا۔صرف چند سجادہ نشینوں نے خانقاہی نظام کی روایتوں کی وجہ سے تحریکِ پاکستان میں حصہ لیا۔اور باقی دیوبندیوں، احراروں ،خاکساروں ،خان عبدالغفار، صمد اچکزئی، جی ایم سید، مولا بخش سومرو اور خضر حیات ٹوانہ وغیرہ نے اپنی کم علمی یا خود غرضی یا ابن الوقتی کی وجہ سے پاکستان کی مخالفت کی۔خاص کر کانگریسی مولوی مادر پدر آزاد اور انگریزوں کے ٹوڈی خضر حیات کے ''غیر فطری اتحاد'' نے ہمارا بڑا نقصان کیا کہ ہم لنگڑا لولا پاکستان حاصل کر سکے۔اگر ہم متحد ہوتے تو آدھا ہندوستان ہمارا تھا۔

15۔ چنانچہ انیسویں صدی کی اسلام کے بارے میں ہماری ''کم علمی'' اور ہماری ''بے عملی'' ہمیں لے ڈوبی کہ ہم غیروں کی اسلام کے خلاف اس سازش کو اب بھی نہیں سمجھ رہے، اور اپنے اندر سے ان ''مہروں'' کو تلاش نہیں کرتے۔جن کی تحریروں میں اتنی زیادہ ''بد دیانتیاں'' ہیں کہ ہمیں ان کو منہ نہ لگانا چاہیے۔لیکن وہ لوگ ہمارے ''رہنما'' بنے بیٹھے ہیں۔یا کچھ لوگ حق و باطل کو گڈ مڈ کر کے بقول حضرت عمر رضی اللہ عنہ اسلام کو پاش پاش کر رہے ہیں۔اس مضمون کو یہ عاجز عملی طور پر آگے چل کر کے کئی تناظر سے

اوروساطتوں سے زیرِ بحث لائے گا۔فی الحال مثال کے طور پر ایک ایسے ''مہرے'' کی بات ہوگی ،جس کی سب تحریروں میں بڑا مقصد یہ ہوتا ہے کہ روحِ محمدﷺ ہمارے بدنوں سے نکل جائے یا ہم جہاد کے نظریہ کے ساتھ نفرت کرنا شروع کردیں۔

16۔ میری حیرانگی کی کوئی حد نہ رہی کہ مودودی نے ایک طرف مسلم قومیت کا ''پرچار'' کیا اور دوسری طرف تحریکِ پاکستان کی مخالفت کی۔پھر پاکستان کے بن جانے کے بعد کشمیر کے جہاد کے سلسلہ میں ہم مسلمانوں کو تین گروہوں میں بانٹ دیا اور سورۃ الانعام کی آیت مبارکہ 159 کی خلاف ورزی کی۔اس کے بعد سورۃ النسا کی آیت مبارکہ 75 کی خلاف ورزی کرتے ہوئے ہم اہلِ پاکستان کے لئے کشمیر کے جہاد میں شمولیت کو حرام قرار دے دیا تھا وغیرہ۔پھر 1953ء میں قادیانیوں کے خلاف کچھ لکھا ضرور لیکن خود عملی طور پر تحریک سے الگ رہا اور دوسروں کو'' قربانی کا بکرا'' بنوایا۔مودودی کو پھانسی دینے کے اعلان کا ''ڈرامہ'' بھی کیا گیا۔لیکن اس سب ''ڈرامے'' یا تحریک میں اصلی مقصد چھپے قادیانی جسٹس منیر سے مودودی کو ''مفکرِ اسلام'' بنوانا تھا کہ اپنی گستاخیوں اور بے ادبیوں اور تحریری بددیانتیوں سے وہ مسلمان قوم کو گمراہ کرتا رہے۔

17۔ یہ عاجز حیران تھا کہ نیاز فتح پوری، جو سرسید کی طرح نیچریہ عقیدہ رکھتا تھا ،اس کا شاگرد کم علم مودودی ''مفکرِ اسلام'' کیسے ہوسکتا ہے۔اور کوئی اسلام کا عالم اس کو ''لگام'' کیوں نہیں دیتا کہ مودودی کے عقیدوں کی تو کئی صاحبان نے مخالفت کی ،لیکن کسی نے اس کی ''علمیت'' کو چیلنج نہ کیا۔اور اس کی بڑی وجہ یہ ہے کہ مودودی ''اندھوں میں کانا'' سردار ہے۔اور قوم کو

میرے 19 فروری 96ء کے خط کے پیرا 3 کے الفاظ کے حق ہونے کا بہت بڑا ثبوت میسر ہوگیا، کہ ہمارے ''علماء'' کتنے نابلد ہیں۔

18۔ اب معلوم نہیں کہ کرنل شیخ عبدالرؤف کو کہیں سے اشارہ ہوا یا جو کچھ ہوا، وہ مجھے کہنے لگے کہ ''روزِ قیامت ہمارے آقا محمد مصطفٰے صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اگر تم سے پوچھ لیں کہ تم مودودی کی ''کم علمیوں''، ''بددیانتیوں'' اور'' گستاخانہ اور متکبرانہ تحریروں'' سے آگاہ تھے تو قوم کو اس پہلو سے آگاہ کیوں نہ کیا؟'' تو مجھ پر رقت طاری ہوگئی۔تو میں نے اس سلسلے میں چھوٹی سی کتاب لکھ دی ہے۔اور اب میری طرف خطوط کا تانتا بندھا ہوا ہے۔کئی دانشور نادم ہوئے کہ آسان زبان اور مودودی کے طرزِ بیان سے متاثر ہوکر وہ تفہیم کے اکثر مضامین کے نفوس کے اوپر تلے سے گزر گئے، اور وہ اس سازش کو نہ سمجھ سکے، جس کو مصنف نے اب طشت از بام کیا ہے۔کچھ نے لکھا کہ اللہ تعالی کا لاکھ لاکھ شکر ہے کہ مودودی کا ''بت'' اب پاش پاش ہو گیا ہے۔اوروں نے یہ کہا کہ خودساختہ مفکرِ اسلام مودودی کی علمیت اور فکر کا بھانڈا چوراہے میں پھوڑ دیا گیا ہے وغیرہ۔

19۔ ہمارے ہاں علماء اور دانشوروں کے لبادہ اوڑھنے والوں، غیروں کی سازش میں مودودی جیسے ''مہروں'' کی شرکت، بدنیتی اور کم علمی والی تحریروں کے قلع قمع کرنے کے سلسلہ میں جو کچھ اس عاجز اور اس کے رفقاء نے کیا یا کر رہے ہیں، وہ کئی کتابوں کا مضمون ہے اور یہاں صرف ایک جھلکی دی جارہی ہے کہ 19 نومبر 2004ء سے 19 مارچ 2005ء تک اس عاجز نے قوم کا نام لے کر خاص کر اور جماعت اسلامی کے رہنماؤں اور دیوبندیوں، بریلوی مسلک کے رہنماؤں کے نام لے کر پانچ بہت لمبے

چوڑے خطوط لکھے کہ مودودی یا اسمٰعیل دہلوی جیسے لوگ اپنی کم علمیوں کی وجہ سے ہمیں ان گروہوں میں بانٹ گئے ہیں۔ میں نے ان کی تحریروں کی ان غلط بیانیوں کے لفظ لفظ کا حوالہ دیا، اور گزارش کی کہ آؤ اس فرقہ بندی کے ذمہ داروں سے ''نجات'' حاصل کریں۔ اگر میں غلط ہوں تو میری تصحیح کی جائے۔ خطوط کی کاپیاں نوائے وقت کے مجید نظامی کو بھی دیں کہ وہ یہ کلمۂ حق شائع کریں۔ لیکن نہ کسی پر کچھ اثر ہوا، نہ کوئی مجھے غلط کہنے کی ہمت کر سکا۔ اور نہ مجید نظامی یہ کلمۂ حق شائع کر سکا۔

-20 اس عاجز نے کھل کر مودودی کی ''تحریری بد دیانتیوں'' پر تبصرے کئے۔ سورۃ الانفال کی آیت مبارکہ 41 میں رب سبحانہٗ نے جنگِ بدر کو ''یوم الفرقان'' کا نام دیا۔ اور آیت نمبر 7 کے مطابق اس جنگ کو اپنی ضرورت قرار دیا کہ رب سبحانہٗ ایسے ہی چاہتے تھے۔ لیکن مودودی اس جنگ کو ''بھڑوں کے چھتے میں پتھر مارنے'' کے مترادف قرار دیتا ہے اور یہ نہ سوچا کہ حضور پاک صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سپہ سالار تھے اور عظیم صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اہلِ لشکر۔ تو مودودی اللہ تعالیٰ سبحانہٗ، ہمارے آقا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور صحابہ کرام کو نعوذ باللہ ''نادانوں'' کے زمرہ میں ڈال دیتا ہے کہ انہوں نے ''نادانوں'' کی طرح قریش کفار کو ''مچھرا'' دیا اور یہ جنگ وجدل شروع ہو گئی، ورنہ۔۔۔۔۔۔۔۔۔ ''توبہ میرے اللہ، مودودی کی اس گستاخی کی وجہ سے ہم پر پتھر برس سکتے تھے۔''

-21 سورۃ آل عمران کی آیاتِ مبارکہ 125 تا 128 میں رب سبحانہٗ مسلمانوں کو جنگِ اُحد کیلئے پانچ ہزار فرشتوں کی مدد کی خوشخبری دینے کے علاوہ اس جنگ میں فتح کی خوشخبری اور دشمن کے ایک حصہ کو کاٹ دینے کا مژدہ بھی

سناتے ہیں۔اور پھر ایسے ہی ہوا کہ ابوسفیان میدانِ جنگ سے فرار اختیار کر گیا اور دوسرے دن مسلمانوں نے حمرالاسد کے مقام تک کفار کا تعاقب کیا، لیکن زیادہ صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کے شہید ہو جانے کی وجہ سے مودودی اس جنگ کو مسلمانوں کی شکست قرار دیتا ہے اور ایک طرح سے تاثر دیتا ہے کہ قرآن پاک میں یہ فرشتوں کی امداد والی باتیں ''گپ شپ'' ہیں، یا ایسی امداد کا کوئی اثر نہیں ہوتا۔اور جنگ اور جہاد کیلیئے ایسی ہی نفرت پیدا کرتا ہے جیسی 1948ء میں جہاد کشمیر کیلیئے کی۔تو اللہ تعالی کے فرمانوں کو ایسا غلط رنگ دے کر مودودی عذابِ الٰہی کو دعوت دے رہا ہوتا ہے اور میں نے جماعتِ اسلامی والوں کو گزارش کی کہ آؤ اس ''تفرقہ باز'' سے چھٹکارا حاصل کریں۔

22۔ یہ عاجز قوم کو توبہ وندامت کی گزارش تو کرتا رہتا ہے۔لیکن ''عذاب کے آنے کے'' الفاظ نہیں لکھتا کہ میری یہ تحریر عذابِ الٰہی ہونے کیلیئے ''حجت'' نہ بن جائے کہ تین مختلف اوقات پر غیر ارادی طور پر جو اس عاجز کے منہ سے تین الگ الگ ملک کے حکمرانوں کیلیئے ''عبرتناک انجام'' کے الفاظ نکلے، تو وہ ایسے ہی ہو گیا جس کا مجھے افسوس ہے۔چنانچہ مودودی کی ان منفی تحریروں کا قلع قمع کرنے کیلیئے اس عاجز نے 14 اگست 1997ء کو قوم کے نام ایک کھلا خط لکھ کر قوم کو آنے والی تباہی سے ڈرانے کی کوشش کی اور تمہید اس طرح باندھی؛

''معزز قارئین!۔۔۔السلام علیکم ورحمتہ اللہ

اللّہ تعالی نے فرشتوں کو حکم دیا کہ جاؤ فلاں بستی کو تہ وبالا کر دو۔فرشتوں نے عرض کی کہ وہاں تو ایک عابد وزاہد بھی رہتا ہے۔اللّہ تعالی نے فرمایا

ہاں، اسی وجہ سے کہ اس نے بھی لوگوں کو میری نافرمانی سے نہ روکا''

''یہ عاجز پچاس سالوں سے قوم کو اللّٰہ تعالیٰ اور رسولِ پاک صلی اللّٰہ علیہ وآلہ وسلم کی نافرمانی سے روک رہا ہے اور صراطِ مستقیم کی نشاندہی کر رہا ہے۔1965ء کے بعد جب ہمارے سب ''بڑوں'' کے ریت کی بنیاد پر اپنی شخصیتوں کے گرد قلعے مسمار ہو گئے تو میں نے ملک کے سربراہوں سمیت سب بڑوں کو برملا اور خطوط سے باور کرایا کہ ہم ان کافرانہ سیاسی، عسکری، معاشی اور عادلانہ نظاموں سے توبہ کر کے رسولِ عربی صلی اللّٰہ علیہ وآلہ وسلم کے اسلام کا نفاذ کریں۔''

اس خط میں اس عاجز نے بہت کچھ لکھا کہ ہمیں قوم کے طور پر رہنمائی میسر نہیں ہو رہی اور ایسے لوگ ہمارے رہنما بنے پھرتے ہیں جو خود اسلامی فلسفہ حیات سے نابلد ہیں یا ان کی تحریروں میں بد نیتی کا عمل کارفرما ہے اور وہ کسی سازش کی کڑی ہیں یا غیروں کی گیم کھیل رہے ہیں۔اور میں نے مودودی کی کافی تحریروں کو مثال کے طور پر پیش کیا۔جن میں سے کچھ اقتباسات یہاں پیش کئے جاتے ہیں۔

''مودودی نے قرآن پاک کی تفہیم کی آڑ میں آیات مبارکہ کی اصل روح سے ہٹ کر دراصل اپنے عقیدے کا پرچار کیا ہے۔مثلاً سورۃ واقعہ کی آیت مبارکہ 91 میں جہاں ارشادِ ربانی ہے''اے میرے حبیب ﷺ دائیں والوں سے آپ پر سلام ہو'' وہاں مودودی عربی کے لفظ ''لک'' یعنی ''آپ'' کا ترجمہ کرتا ہی نہیں، اور کہتا ہے کہ دائیں والوں سے دائیں والوں کو سلام۔ یہ آیت مبارکہ حضور پاک صلی اللّٰہ علیہ وآلہ وسلم کے حاضر و ناظر ہونے کا قرآنی ثبوت ہے۔ چونکہ مودودی، حضور پاک ﷺ کو حاضر و ناظر نہیں مانتا، اس لئے یہ بد دیانتی کی۔

سورۃ آل عمران کی آیت مبارکہ 81 میں سب پیغمبروں سے ہمارے آقا

صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی مدد کے میثاق کا ذکر ہے۔سورۃ نسا کی آیت مبارکہ 41 میں حضور پاک صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو سب گواہوں پر گواہ قرار دیا گیا۔سورۃ اعراف کی آیت مبارکہ 158 میں حضور پاک ﷺ کو تمام مخلوق (اگلی اور پچھلی) کیلئے پیغمبر فرمایا گیا۔سورۃ قصص کی آیات مبارکہ 44 تا 46 میں آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی کوہِ طور کے مغربی کنارے پر موجودگی کا ذکر ہے جب حضرت موسیٰ علیہ السلام کو نبوت عطا کی جا رہی تھی۔ وغیرہ۔ان تمام آیات مبارکہ سے حضور پاک ﷺ کے زمان و مکان پر حاوی ہونے کے واضح قرآنی ثبوت اخذ کئے جا سکتے ہیں۔جو آپ کے حاضر و ناظر ہونے کا ہی ایک طرزِ بیان ہے۔یہ کچھ چونکہ مودودی کے عقیدہ کی مخالفت میں جاتا ہے تو مودودی نے ان تمام آیاتِ مبارکہ کے ایسے ادھورے اور مہمل معنی کئے ہیں جن کو پڑھ کر رونا آتا ہے۔لیکن مودودی اپنا مقصد حاصل کر لیتا ہے کہ ان آیاتِ مبارکہ کے مہمل معنوں کی مدد سے آگے اپنی وضاحتوں میں حضور پاک ﷺ کی شان کو نعوذ باللہ اسی دنیا کیلئے ایک بشر کے طور پر محدود کر دیتا ہے۔یا صرف مسلمانوں کا پیغمبر مانتا ہے۔اور اللہ تعالی جو سورہ بنی اسرائیل کی آیت مبارکہ 60 میں سب لوگوں کو محیط میں لینے کا ذکر کرتے ہیں، مودودی اس کو قریش کے کفار تک محدود کر دیتا ہے۔ایسی بددیانتیوں پر سر ہی پیٹنا پڑتا ہے۔لیکن قارئین کتاب میں مودودی کی ایسی بے شمار بے ادبیاں پڑھیں گے۔بلکہ اللہ تعالی کے لئے جو الفاظ استعمال کرتا ہے یا اپنے الفاظ کو اللہ تعالی کا بیان بنا دیتا ہے۔وہ سب پڑھ کر حیرانگی ہوتی ہے کہ مودودی کس ’’قماش‘‘ کا آدمی تھا اور ہمارے علماء نے یہ سب کیسے برداشت کیا۔‘‘

23- اب یہ عاجز قارئین کو دوبارہ اپنے پیرا 16 اور 17 میں لکھے گئے تبصروں کی طرف متوجہ کرتا ہے کہ ہماری کم علمی کی ایک بدترین مثال ہے کہ نہ مودودی کی زندگی میں ہم اس کو "لگام" دے سکے، نہ اس کے مر جانے کے بعد اس سے "نجات" حاصل کر سکے اور اس کی تحریروں کو سر آنکھوں پر لے رہے ہیں۔ اور اس کی "نافرمانیوں" اور "بدنیتوں" کی طرف دھیان تک نہیں دیتے۔ اور کہتے ہیں کہ وہ کچھ اچھی باتیں لکھ گیا ہے۔ ان سے استفادہ کیا جائے۔ میں کہتا ہوں کہ ابلیس "توحید" کا بہت بڑا عالم ہے، تو کیا "توحید کا علم" ابلیس یا شیطان سے سیکھیں گے۔ چنانچہ ہماری ان کوتاہیوں کی وجہ سے ہم جس عذاب کی زد میں آسکتے تھے، اس سے ڈرانے کیلئے اس عاجز نے اپنے اس کھلے خط کا اختتام ان الفاظ سے کیا:

"قارئین !اپنی ذمہ داری یاد کریں۔ روزِ قیامت اللہ تعالی کو کیا جواب دیں گے۔ اس لئے اگر اور کچھ نہیں کر سکتے تو حسبِ توفیق اس مسودہ کی چند فوٹو کاپیاں ہی بنوا کر لوگوں میں بانٹ دیں تاکہ دردناک عذاب کی گھنگور گھٹائیں جو ہماری فضا میں چھائی ہوئی ہیں وہ "کچھ دیر" کیلئے رکی رہیں۔"

24- چنانچہ پاکستان کے وجود میں آجانے کے بعد ہم جو لگاتار ذلت کی زندگیوں سے دوچار ہیں، ایک آزمائش کے بعد دوسری آزمائش شروع ہو جاتی ہے، اس میں قصور ہمارا اپنا ہے۔ اور اللہ تعالی کی نافرمانیوں کے علاوہ ہماری "کم علمیوں" اور "بے خبریوں" نے ہمیں مردہ قوم بنا دیا۔ جس کا اشارہ ربِ سبحانہٗ نے سورۃ البقرہ کی آیت مبارکہ 243 میں بھی فرما دیا اور جو لوگ موت سے ڈر کر بھاگ رہے تھے، ان کیلئے فرمایا "مر جاؤ"، جس

کے سلسلہ میں مزید وضاحت آگے آرہی ہے۔

25۔ بہرحال اس عاجز کے اس 18 فروری 96ء کے چند الفاظ کے خط میں بے حساب الفاظ پنہاں ہیں اور تمہیدی فقرہ میں لکھا کہ اسلام میں سورۃ الانعام کی آیت مبارکہ 159 کے مطابق کوئی فرقہ بندی نہیں۔ اب مودودی اور اسمٰعیل دہلوی کی تحریری بد دیانتیوں یا گستاخیوں کو اگر سمجھ لیں اور ان دونوں سے اگر ''نجات'' حاصل کرلیں، تو بریلوی، دیوبندی اور اہل حدیث کی گرہ بندی ختم ہو جاتی ہے۔ اب جو شیعہ سنّی گروہ بندی ہے اس کی تفصیل پیرا 58 میں آرہی ہے۔ رہ گئی ''فقہی گروہ بندی''، تو آخری امام احمدؒ بن حنبل کی وفات سے سو سال بعد ایسے گروہوں کے نام سننے میں نہ آئے تھے۔ امام حنبلؒ، امام شافعیؒ کے شاگرد تھے اور امام شافعیؒ، امام مالکؒ کے شاگرد تھے اور امام مالکؒ نے چند دن امام اعظمؒ کی شاگردی کی اور امام اعظمؒ، امام جعفر صادقؒ کے شاگرد تھے۔ امام حنبلؒ نے امام ابو یوسفؒ کی بھی شاگردی کی، جو امام اعظمؒ کے بھی شاگرد تھے۔ فقہ، اسلام کی دوسری صدی ہجری میں منصور عباسی کے زمانے میں امام ابو یوسفؒ اور امام محمدؒ نے مدون کیا، جو دونوں امام اعظمؒ کے شاگرد تھے۔ اور اپنے استاد کا ادب ملحوظ رکھتے ہوئے فقہ کا نام امام اعظمؒ کی کنیت حنیف پر ''فقہ حنفیہ'' رکھ دیا۔ عباسی خلفاء کی تقریباً دو سو سال حکومت کے دوران یہی فقہ چلتا رہا۔ لیکن امام اعظمؒ ''عجمی'' تھے۔ تو بعد میں کسی عرب تعصب کی وجہ سے ''مالکی''، ''شافعی'' اور ''حنبلی'' فقہوں کو آگے کیا کہ تینوں صاحبان عرب تھے۔ لیکن ایک استاد کا شاگرد، اپنے استاد کے گروہ کے مقابلے میں دوسرا گروہ کیسے بنائے گا اور فقہ جعفریہ کا نام تو بیسویں صدی میں سننے میں آیا۔ تو فقہی گروہ بندی کی کوئی

بنیاد نہیں ہے۔

26۔ اب اگر اسلام میں فرقہ بندی یا فقہی گروہ بندی کی اجازت نہیں تو سیاسی گروہ بندی کی اجازت کیسے دی جاسکتی ہے کہ لفظ ''سیاست'' نہ قرآن پاک میں ہے اور نہ احادیثِ مبارکہ میں ہے اور شیطان بھی کہتا ہے؛ ؎

'' جمہور کے ابلیس ہیں ارباب سیاست

باقی نہیں اب میری ضرورت تہہِ افلاک''

ہم آگے چل کر مجید نظامی اور اخبار نوائے وقت کے عوامل پر پورا تبصرہ کریں گے کہ وہ کہتے ہیں کہ پاکستان چونکہ سیاست کی پیداوار ہے، اس لئے یہاں پر اسی سیاسی عمل کو چلنا چاہیے۔ یہ ایک بہت بڑا المیہ ہے اور آگے آنے والے پیرا30 میں واضح کریں گے کہ یہ ہماری غلامی کی مجبوری تھی کہ ہمارا حکمران انگریز کسی اور ''کھیل''، یعنی جہاد وغیرہ کی اجازت نہ دیتا تھا۔

27۔ بے شک انیسویں اور آدھی بیسویں صدی ہماری ذلت کی صدیاں تھیں۔ اور ہماری کم علمیوں نے ہمیں مومن کی فراست سے اس طرح عاری کر دیا کہ آزادی کے بعد بھی ہم جمہوری کافرانہ نظام کے ساتھ ''چمٹے'' رہے یا اب بھی ''چمٹے'' ہوئے ہیں۔ اور اسی وجہ سے میں نے اپنے اس چھوٹے سے خط میں بار بار کافرانہ نظاموں یا کافرانہ سیاسی نظاموں کا ذکر کیا ہے کہ ان مادر پدر آزاد سیاسی نظاموں کے تحت ہم لوگوں، خِطّوں اور علاقوں کو اللہ تعالیٰ کی آمریت میں ''شرکت'' دے دیتے ہیں۔ اور پھر اللہ تعالیٰ اپنے ان ''شریکوں'' کو عبرتناک انجاموں سے دوچار فرما دیتا ہے۔ اور اس طرح سے قوم کیلئے ذلت کی گھڑیاں ختم ہوتی نظر نہیں آتیں۔

28۔ اس سلسلہ میں اس عاجز اور میرے رفقاء نے جو تحقیق اور مطالعہ کیا ہے، یا جتنے مضامین لکھے ہیں، ان باتوں کو اختصار سے بیان کرنے کیلئے بھی کئی صفحات کی ضرورت ہے۔ ہمارے ''دانشور'' جو کوئی بھی باطل اصطلاح جیسے ''جمہوریت'' یا ''انقلاب'' یا ''سوشلزم'' کا نام سنتے ہیں تو کہہ دیتے ہیں کہ یہ اسلام میں بھی ہے۔ اور ان باطل نظریوں کے ساتھ اسلام کا نام چسپاں کر دیتے ہیں۔ جیسے سؤر پر تکبیر پڑھ کر اس کا گلا کاٹ دیا جائے اور کہہ دیا جائے کہ یہ ''حلال'' ہو گیا ہے۔ اسلام از خود ایک مکمل نظریہ ہے (سورۃ المائدہ، آیت مبارکہ 3)۔ اس کو کسی ''اسم صفت'' کی ضرورت نہیں۔ چنانچہ مجبور ہو کر 9 دسمبر 1996ء کو اس عاجز نے قوم کے نام ایک اور کھلا خط لکھ دیا کہ کافرانہ سیاسی نظاموں کے تحت یہ انتخابات ہمارے مسائل کے حل نہیں۔ چنانچہ پیرا 24 میں جو سورۃ البقرہ کی آیت مبارکہ 243 کا ذکر ہے، وہ اشارہ 1947ء کے ہمارے مشرقی پنجاب سے فرار کی طرف بھی ہوسکتا ہے کہ کافرانہ سیاسی نظام کے تحت جو پاکستان حاصل کیا تو ستر ہزار نوجوان عورتیں بھی کفار کے پاس چھوڑ آئے تھے۔ اور نہ صرف ان علاقوں سے اسلام کا نام مٹ گیا، بلکہ پاکستان میں بھی ہم نے کافرانہ رومن قوانین کے تحت جو آئین بنائے تو ہم ایک ''مردہ'' قوم ہیں۔

29۔ ملک کے عظیم دانشور اور مومن کی فراست والے ایک صاحب اور نواسۂ رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم جنرل سیّد رفاقت کے خط کے چند الفاظ یہ ہیں:-

''آپ نے جو خط 9 دسمبر کو لکھا ہے میں اسے ایک منفرد اور تاریخی دستاویز قرار دینے میں کوئی جھجک یا ہچکچاہٹ محسوس نہیں کرتا۔ ان

تیئیس 23 نکات میں آپ نے پاکستان کے بنیادی محرکات سے لیکراس کے موجودہ انحطاط تک کا کیا ہی خوبصورت تجزیہ کیا ہے(خوبصورت کا لفظ استعمال کرتے ہوئے گھبرا رہا ہوں۔کیونکہ جن حالات اور اسباب کی آپ نے نشاندہی کی ہے وہ خوفناک اور بھیانک ہیں)۔ان چار صفحات کے اندر آپ نے اس مملکتِ خداداد کے عروج وزوال کی کہانی اس ربط اور منطق کے ساتھ پیش کی ہے جو صرف آپ ہی کر سکتے ہیں۔اس کا ایک ایک حرف اور ایک ایک فقرہ ظاہر کرتا ہے کہ اس تجزیہ کا خالق وہی ہوسکتا ہے جسے اللّٰہ تعالیٰ وسبحانہٗ نے بے حساب بصیرت ،بے پناہ دردِ دل ،بے حد قوت مطالعہ و مشاہدہ،انتھک مزاج اور ہمالیہ سے بھی بلند جرأت بخشی ہے۔جزاک اللّٰہ ۔یہ تیئیس نکات کا تجزیہ ایک غیر معمولی دستاویز ہے۔ایک ایسی دستاویز اور ایک ایسا پیغام جو پاکستان کے بچے بچے تک پہنچنا چاہیے۔"

چنانچہ ہم اس خط کے چند نکات کو آنے والے پیراگرافس میں پیش کررہے ہیں؛

30۔ یہ ملک ہم نے نہ لہو سے خریدا اور نہ اسلام کی طرزِ زندگی والے فلسفہ جہاد سے حاصل کیا کہ غالب حکمران طاقت یعنی انگریز اس کی اجازت نہ دیتا تھا۔تو کافرانہ سیاسی نظام کی ایک آئینی ضرورت پوری کر کے اور بھیڑ بکریوں کی طرح قربانی دے کرلنگڑا لولا پاکستان حاصل کیا۔قائداعظم بے چارہ ایک دیانتدار وکیل تھا۔اللّٰہ تعالیٰ نے اس کو ایک مومن کی فراست عطا فرمادی تھی۔اس بے چارے نے کوئی فلسفہ نہیں دیا اور نہ علامہ اقبال نے

کوئی فلسفہ دیا۔ وہ دونوں حضور پاک محمد مصطفٰی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے غلام تھے۔ ان کو جو آج کل ہم حضور پاک صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی نبوت میں ''شرکت'' دے رہے ہیں، اس سے توبہ کریں اور ہر زمانے کیلئے رہبرو رہنما محمد مصطفٰی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا نعرہ لگائیں۔ اور قائداعظم کے پاکستان کی بجائے اپنے ملک کو اللہ ورسولِ پاک ﷺ کا پاکستان کہیں۔

31۔ 14 اگست 1947ء سے اسلام کا نفاذ ضروری تھا۔ کہ جہاد کو طرزِ زندگی کے طور پر اپنا لیتے۔ اللہ تعالی نے سبب بھی پیدا کیا کہ مشرقی پنجاب میں فسادات شروع ہو گئے۔ خان قیوم نے لیاقت علی کو مشورہ دیا کہ قبائلی مجاہدین کو مشرقی پنجاب میں داخل کر دیں۔ اگر ایسا کرتے تو بھارت میدانِ جنگ بن جاتا۔ کشمیر آسانی سے حاصل کر لیتے۔ اور ستر ہزار نوجوان عورتیں کفار کے پاس نہ چھوڑتے۔ لیکن ہم نے کافرانہ بین الاقوامی سیاست کا سہارا لیا۔ اور ذلت سے دوچار ہوئے۔

32۔ اس کے بعد بھی اللہ تعالی نے کشمیر میں جہاد کے راستے کھول دیئے لیکن ہم نے قبائلی مجاہدین کو غلط وقت پر غلط طریقوں سے غلط جگہوں پر استعمال کیا۔ یعنی جموں اور پونچھ کی بجائے سری نگر کی طرف استعمال کیا، اس کے باوجود اور کئی غداریوں اور کوتاہیوں کے باوجود پانچ ایسے مواقع آئے کہ 48-1947ء میں ہم بھارتی افواج کو ایسا تہس نہس کر سکتے تھے کہ ہندو حیدرآباد کی طرف میلی آنکھ سے بھی نہ دیکھتا۔ لیکن افسوس ہم نے نظریہ جہاد کو جمود دیا۔ تو پچاس سال سے ایک ہزار میل لمبی فائر بندی یا کنٹرول لائن پر پتھروں اور جنگلوں میں بیٹھ کر ٹھک ٹھک کر رہے ہیں۔ اور بھارتی ہماری عورتوں کے ساتھ کیا نہیں کر رہے۔

33۔ 1951ء میں ''جھرلو'' انتخابات کے ذریعے پنجاب میں ممتاز دولتانہ کو لایا گیا۔1953ء میں جب بے عزتی کے ساتھ دولتانہ کو وزیر اعلیٰ کی کرسی سے ہٹایا گیا تو اس کے ''پروردوں'' نے اس کا ساتھ نہ دیا۔اس زمانے میں یہی کچھ صوبہ سرحد میں قیوم خان نے کیا۔چند سال بعد جب اس کو وہاں پر اپنا ''جانشین'' مقرر کرنے کو کہا گیا تو ان ''گھپاچوؤں'' میں اسے ایک آدمی نہ نظر آیا جس کے سر پر وہ یہ ''تاج'' رکھتا۔پہلے یہ تاج اپنے پرائیویٹ سیکرٹری غلام اسحٰق (بعد میں ملک کے صدر) کو پہنانا چاہا، وہ نہ مانا تو انسپکٹر جنرل پولیس سردار عبدالرشید کے سر پر یہ تاج رکھ دیا۔چند ماہ بعد جب سرحد کے دورے پر آیا تو اس کے ''جانشینوں'' نے کالی جھنڈیوں سے اس کا ''استقبال'' کیا۔اس زمانے کے ان کافرانہ نظاموں کے تحت انتخابات کے گاڈ فادر اور 1949ء کے قرارداد مقاصد میں لوگوں کو اللہ کا شریک بنانے والا لیاقت علی بھی 1951ء میں گولی کا شکار ہو گیا کہ کشمیر بھارت کو دے گیا تھا۔

34۔ سندھ میں ان منتخب اداروں کے کرتا دھرتاؤں سے ایوب کھوڑو، پیر الٰہی بخش، غلام علی تالپور اور پیرزادہ عبدالستار وغیرہ کو جن ذلتوں سے دوچار ہونا پڑا یا 1954ء کے بنگال کے انتخابات میں شریف نور الامین ایک طالب علم سے شکست کھا گیا۔ہماری قوم ان عبرتناک نتائج پر دھیان کیوں نہیں دیتی۔

35۔ 1956ء کے کافرانہ آئین بنانے والے چودھری محمد علی نے غدار میر جعفر کے پڑپوتے سکندر مرزا کو اللہ اور رسولِ پاک ﷺ کے نام پر بنائے گئے ملک کا پہلا صدر بنایا۔پھر اسی صدر اور اس کافرانہ آئین کا پہلا شکار بھی خود

بنا۔ اور سکندر مرزا کی لاش کے ساتھ جو کچھ ایران میں ہوا، ان باتوں سے ہم عبرت کیوں نہیں پکڑتے۔ (سکندر مرزا کی لاش لندن سے لا کر ایران میں دفن کی پھر وقت آیا کہ لاش کو قبر سے نکال کر باہر پھینک دیا گیا)۔

36۔ ایوب کا 1962ء کا آئین کچھ اسلام کے نزدیک تھا کہ سنجیدہ اور چنیدہ لوگوں سے رائے لی گئی اور ملک کا ایک امیر یا صدر تھا کہ وزیر اپنی مرضی سے بناتا۔ اور لوگوں کے ''چنیدہ'' اگر وزیر بنتے تو اسمبلی کی ممبری چھوڑنا پڑتی۔ تو ایوب کچھ بچ گیا۔ لیکن بعد میں اس میں ترمیم کر کے آئین کا رخ کافرانہ نظاموں کی طرف کر دیا۔ تو 65-1964ء کے انتخابات سے ملک پر جنگ کی نازک گھڑی نازل ہوئی۔ 6 ستمبر 1965ء کو بی آر بی کے پاس اس عاجز نے چیختے چلاتے بچوں اور کچھ عورتوں کو دیکھا جو کہہ رہے تھے کہ بھارتی ہماری نوجوان عورتوں کو لے گئے ہیں۔ اگر خودکشی کی اسلام میں اجازت ہوتی تو یہ بہترین موقع تھا کہ قوم اپنی عورتوں کی حفاظت نہ کر سکی۔ میں البتہ پکار اٹھا، ''اے حجاج بن یوسف! جو تمہیں ظالم کہتے ہیں وہ بکواس بکتے ہیں، تو نے دو مسلمان عورتوں کی عزت کیلئے موجودہ مغربی پاکستان کی اینٹ سے اینٹ بجا دی۔ ہم بے غیرت ہیں۔'' اور اس جنگ میں جو جھوٹ بولے گئے تو ایوب خان جس نے 1948ء کے کشمیر کے جہاد میں کشمیر میں داخلے کے بغیر ہلالِ جرأت حاصل کر لیا تھا۔ اس کو یہ جھوٹ اپنے جھوٹ سے بڑے جھوٹ نظر آئے۔ قوم کو بیوقوف بنایا گیا کہ وہ ہماری فتح تھی۔ نتیجہ چھ سال بعد دیکھ لیا۔ البتہ ایوب کے ان ''منتخب'' لوگوں نے اس کے ''پروردہ'' ذوالفقار بھٹو کے تحت ''ایوب کتا ہائے ہائے'' کے نعرے لگائے۔ ہماری قوم جس کو محمد ﷺ سے وفا کے بدلے لوح و قلم

نصیب ہونے تھے، بھٹو نے ان کا دامان تنگ کر کے ان کے ہدف کوروٹی، کپڑا اور مکان کی طرف پھیر دیا۔

37۔ 1970ء میں یحیٰی خان نے ان کافرانہ نظاموں کے تحت انتخابات کرائے تو پہلے تو ہماری جاہل قوم نے ان ''صاف شفاف'' انتخابات پر یحیٰی خان کو خراج تحسین پیش کیا۔ کچھ لوگوں کو البتہ ندامت تب ہوئی جب ملک بھی دولخت ہو گیا اور نوے ہزار فوجیوں سے ہتھیار ڈلوا کر ہم نے اپنی ہزار سال کی تاریخ کو ذلت میں ڈبو دیا۔

38۔ 1977ء میں ذوالفقار بھٹو نے کافرانہ نظام کے تحت انتخاب کرائے تو اس کو پھانسی چڑھنا پڑا۔ ضیاالحق کے 1985ء کے انتخابات سیاسی گروہ بندی کے بغیر تھے تو وہ کچھ بچ گیا اور اس کو سمجھایا گیا کہ انتخابات مثبت نتائج نہیں پیدا کرتے۔ لیکن اسلام کے ساتھ فراڈ کر کے اپنی مرضی کے ''مثبت نتائج'' کی تگ ودو میں وہ اپنے بھی پرخچے اڑوا بیٹھا۔

39۔ غلام اسحٰق بے چارہ انتخابات کے بغیر اور کسی چیز کے بارے سوچ ہی نہ سکتا تھا۔ تو پہلے اس کو غدار کی مکار بیٹی اور کچی بچی بے نظیر سے ''پالا پڑا''، تو اس نے ایک اور ''تجربہ'' کیا اور اپنی مرضی کے آدمی نواز شریف کو لے آیا، تو دونوں کے درمیان جوتیوں میں دال بٹنا شروع ہو گئی البتہ المیہ سے بچ گئے کہ ''زیادہ بد دیانت'' نہ تھے۔ میں نے دونوں کو بہت کچھ لکھا اور نواز شریف کو تو بعد میں بھی بہت سمجھایا۔ اور 16 نومبر 1993ء کو آخری تنبیہ کر دی کہ مجھ سے رہنمائی حاصل کر کے اللّٰہ تعالی اور رسولِ پاک ﷺ کے راستے پر آئے۔ ورنہ اس کیلئے ذلت ہی ذلت ہے۔ یہ کچھ 4 نومبر 95ء کو نوائے وقت میں شائع بھی ہوا۔ اور اب میری کتاب ''اسلامی نظام

حکومت'' کا حصہ بھی ہے اور باعث بھی بنا۔

40۔ آگے بے حساب خطوط ہیں اور لمبی کہانی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اب تک میری ہر پیش بینی پوری کی اور آگے بھی انشاءاللہ یہ پوری ہوں گی۔ تو نواز شریف نئی شیروانیاں بنوانے کا تردد نہ کرے۔ اول تو اس کافرانہ نظام کے تحت وہ وزیراعظم بن نہ سکے گا اگر چند دنوں کیلئے بن بھی گیا تو پہلے کی نسبت اور زیادہ ذلت سے اس کو یہ کرسی چھوڑنا پڑے گی۔

41۔ اب قارئین کو معلوم ہے کہ 1997ء میں انتخابات ہوئے اور نواز شریف جیسا ''کچا وچھا'' اور عامیانہ ذہن کا آدمی دوسری دفعہ ہمارا وزیراعظم بن گیا اور 1999ء میں بےعزتی سے کرسی سے ہٹایا گیا بلکہ آج کل اس کو ''دیس نکالا'' ملا ہوا ہے۔ جو لوگ بےنظیر کو پاکستان کی ''تقدیر'' گردانتے ہیں، وہ بھی سوچ لیں کہ بھٹو اور اس کا خاندان کس ''حشر'' سے دوچار ہو رہے ہیں۔

42۔ قارئین سے گزارش ہے کہ کیا ''مائی کا کوئی لال'' ان سچی باتوں اور حقائق کو جھٹلا سکتا ہے؟ پھر قوم ان باتوں سے ''بےخبر'' کیوں ہے؟ یہی بہت بڑا المیہ ہے کہ ہمارے اخبار نویس اور دانشوری کا لبادہ اوڑھنے والے نہ ان ''حقائق'' کی پیش بینی کر سکے، نہ بروقت قوم کو صورتِ حال سے آگاہ کر سکے۔ نہ بعد میں ایسے حقائق یا سچی باتوں کو تلاش کر سکے۔ وجہ یہ ہے کہ یہ لوگ مومن کی فراست سے عاری ہیں یا مودودی کی طرح کسی سازش کی ''کڑی'' ہیں۔ چنانچہ اس عاجز نے اپنے 19 فروری 96ء کے بنیادی کھلے خط کے پیرا 4 میں کھل کر کہہ دیا کہ اخباروں اور خاص کر نوائے وقت نے ہمارا رخ خانہ کعبہ کی طرف نہ ہونے دیا۔ اس لئے تمام تر معاملات

ثبوتوں کے ساتھ گہری تحقیق کی دعوت دے رہے ہیں۔

43۔ بہر حال اس اخبار نوائے وقت کا معاملہ بڑا عجیب و غریب ہے کہ میں اپنی کتاب ''پنڈورا باکس'' میں بھی بہت کچھ لکھ چکا ہوں کہ میرے لحاظ سے اس اخبار نے پاکستان کا بھی بہت نقصان کیا ہے۔لیکن اسلام کے نقصان میں تو یہ اخبار مرزا غلام کذاب اور سر سید کو بھی پیچھے چھوڑ گیا ہے۔لیکن حیرانگی کی بات ہے کہ اب تک یہ اخبار دائیں بازو اور ''اسلام پسندوں'' کا ''گاڈ فادر'' بنا ہوا ہے۔اور 1979ء تک میں خود اس اخبار کے ''مداحوں'' میں شامل رہا۔تحریکِ پاکستان کے زمانے میں ہم خیالی قدرتی امر تھا جو قائم رہی کہ 1953ء کے لاہور کے مارشل لاء کے دوران میں نے حمید نظامی (مجید نظامی کے بڑے بھائی) کو فوجیوں کے عتاب سے کئی دفعہ بچایا۔

44۔ اب لطف کی بات یہ ہے کہ مجید نظامی ''مسٹر پاکستان'' بنا ہوا ہے۔اور قوم کی ''رہنمائی'' کا لبادہ بھی اوڑھے ہوئے ہے۔اور اس عاجز کے پچھلے دو سالوں میں اخبار کے ''سنڈے میگزین'' میں لگا تار مضامین شائع ہوتے رہے، جن کو اخبار نے ''چشم کشا'' مضامین کا نام دیا۔اور اس سے پہلے 1979ء اور 1985ء میں بھی میرے کچھ مضمون شائع ہوئے۔تو قارئین کو پوچھنے کا حق ہے کہ یہ کیسا ''اتحاد'' تھا۔تو یہ عاجز اس کو ''مصلحت'' کا نام دے گا۔کہ اخبار نوائے وقت زوال پذیر ہے اور اس کی ساکھ گر رہی ہے۔ان کو کچھ حق اور سچ کی ضرورت تھی کہ وہ کچھ ''انکشاف'' کریں۔میں نے بھی سوچا کہ چلو کچھ سچ تو قوم کے سامنے آ رہا ہے۔اس کو Unholy Alliance (غیر فطری یارانہ) بھی کہہ سکتے ہیں۔اور اس عاجز نے اس کو

فطری (Holy) بنانے کی کوشش کی۔لیکن جب اسلامی فلسفہ حیات اور اسلامی نظامِ حکومت کے مضامین آجاتے تھے تو مجید نظامی ان کی اشاعت کو روک لیتا تھا۔کہ کوئی گہرے چھپے ہاتھ اس اخبار کی پالیسی کو ''کنٹرول'' کرتے ہیں کہ جب صحیح طور پر اسلامی صراط مستقیم اورنشانِ راہ سامنے آجائے تو اس کو روک لو۔

45۔ میں آگے چل کر بھی کئی ثبوتوں سے واضح کروں گا کہ یہ اخبار حق و باطل کو الگ خانوں میں بانٹنے کو تیار نہیں اورفرقہ داری وغیرہ کو controversial قرار دے کراس سلسلہ کے حقائق کوشائع کرنے سے گریز کرتے ہیں۔کسی مضمون میں کچھ حقائق نکھر کر سامنے آجائیں تو اس بات کو آگے نہیں بڑھاتے اور اس سلسلہ میں کوئی اور مضمون نہیں شائع کرتے۔کہیں کوئی باطل فلسفے کی بڑائی کر دے اور اگر ایسے تاثر کورد کرنے کیلئے کوئی مضمون لکھا جائے تو وہ بھی شائع نہیں کیا جاتا۔اوراخبار نوائے وقت کسی پہلو کو حتمی حد تک نہیں لے جانا چاہتا۔پس جو کچھ وہ سمجھیں کہ یہ صحیح ہے وہی ''سچ'' اور ''حق'' ہوتا ہے۔مثال کے طور پر ''جمہوریت'' مجید نظامی کے ایمان کا حصہ ہے اور وہ چاہے تو اس کو ''کنٹرول'' کرسکتا ہے۔کہ اکثر کہتا رہتا ہے کہ ملک میں صرف دو پارٹیاں ہونا چاہییں۔لیکن ایوب خان نے جمہوریت کو کنٹرول کر کے بڑی غلطی کی تھی۔مجید نظامی، جمہوریت کو اسلامی بنا سکتا ہے لیکن ضیاء الحق کو حق نہ تھا کہ وہ ایسے کرتا۔وغیرہ۔

46۔ اس لئے اگر نوائے وقت کی پالیسیوں کا گہرا مطالعہ کیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ وہ قوم کو ''بھول بھلیوں'' میں رکھنا چاہتا ہے اور ہر بحث کو ادھورا رکھنا چاہتا ہے کہ قوم مل کر کسی نشانِ راہ پر متحد نہ ہو جائے۔اب لطف کی بات یہ

ہے کہ باقی اخبار نویس اور دانشوروں میں کچھ لوگ مجید نظامی سے بھی بدتر اور گئے گزرے ہوئے ہیں۔ اور ان سب لوگوں نے قوم کو گمراہی کے سوا کچھ بھی نہیں دیا۔ کہ ہماری اخباروں میں ہمارے لئے کوئی نشانِ راہ نظر نہیں آتا۔ کہ اکبر بگتی جیسے گئے گزرے آدمی نے ایک دفعہ کہا تھا کہ ''جس دن اخبار شائع نہیں ہوتا، وہ دن اس کیلئے بہتر دن ہوگا۔'' لیکن افسوسناک بات یہ ہے کہ ہماری قوم اخبار نویسوں اور اہلِ قلم کی ان کوتاہیوں اور نالائقیوں کے بارے بالکل ''بے خبر'' ہے۔ میرا ارادہ تھا کہ اس سلسلے میں ایک کتاب لکھتا کہ بے حساب مواد میرے پاس موجود ہے، لیکن مجبوراً اس مضمون کو اختصار سے بیان کر رہا ہوں۔

47۔ اول تو یہ خطہ یا برصغیر مردم خیز نہیں۔ اور کسی بھی ''میدان'' میں عالمی شہرت کے حامل لوگ یا شخصیات یہاں پر بہت کم پیدا ہوئیں۔ تو کام کی ''تحریریں'' بھی ناپید ہیں۔ ہندوؤں کی مذہبی کتابوں یعنی ویدوں اور پرانوں کو اگر آسمانی اور روحانی کتابیں مان بھی لیا جائے تو ان کی باتیں ''وقتی'' تھیں۔ اور ان سے کوئی فائدہ نہیں اٹھایا جا سکتا۔ پرانے زمانے میں صرف ایک شخص منوسمرتی کی کتاب ''بھگوت گیتا'' ملتی ہے۔ جس میں اشرف المخلوقات انسانوں کو ذات پات میں بانٹ کر اور کچھ لوگوں کو شودر یا چنڈال یعنی نیچی ذات کے لوگ بنا کر انسانیت کی تذلیل کی گئی ہے۔ حضرت عیسٰی علیہ السلام سے قبل چند صدیوں پہلے چندر گپت موریا کے زمانے میں چانکیہ نے جن دغابازوں کے طریقے اپنانے کی تحریریں چھوڑی ہیں تو اس کو بھارت کا ''میکاویلی'' کہا جاتا ہے۔ بعد کے ہندو اہلِ قلم کمارل بھٹ اور شنکر اچاریہ وغیرہ بدھ مذہب کے ساتھ تعصب کی

پیداوار ہیں۔ اوران کی تحریروں میں مبالغہ آمیز ''ہجو'' اور خوشامد کے بغیر کچھ بھی نہیں۔ ہمارے ہاں جو میراثی ''کبت'' کہتے رہتے ہیں یہ انہی روایات کا حصّہ ہیں۔ اور ہندوؤں کی تاریخ پر کوئی مستند کتاب موجود نہیں۔ رامائن اورمہا بھارت کے اکثر بیانات بالکل افسانوی ہیں کہ عقل ان کو تسلیم نہیں کرتی۔ ہاں البتہ یہ ہندوؤں کی خوش قسمتی ہے کہ ہمارے قائداعظم کو چھوڑ کر ہمارے باقی رہنماؤں کی نسبت ہندوؤں کو جو گاندھی، نہرو، پٹیل وغیرہ بہتر قسم کے رہنما میسر ہو گئے تھے۔ تو ان کو ہمارے مقابلے میں بہتر قسم کے اخبار نویس بھی میسر ہو گئے تھے۔ اور اس ''میدان'' میں وہ اب بھی ہم سے آگے ہیں۔

48۔ بہر حال مسلمان تو کسی ''تحریر'' یا دوسرے علم کے محتاج نہیں ہوتے۔ ان کے پاس قرآن پاک ہے۔ اور سنت نبوی ﷺ کے لکھے ہوئے خزانے بھی ہیں۔ اور ہمارے کئی عالم اور فقرا ان علوم کو سینہ میں اٹھائے ہوتے ہیں۔ صرف ان علوم کو زمانے کے تناظر میں لوگوں کو پیش کرنا ہوتا ہے۔ اور اسلام کے آنے کے بعد تحریری طور پر بھی بابا فرید شکر گنجؒ یا امیر خسروؒ جیسے ہزاروں صاحبان ان علوم کا تحریری پرچار بھی کرتے رہے۔ لیکن المیہ ایک شیخ مبارک اور اس کے دو ابن الوقت بیٹوں فیضی اور ابو الفضل نے شروع کیا، کہ اکبر بادشاہ اور کئی امراء کو گمراہ کیا۔ جس کے خلاف بند باندھنے کا کام تو شیخ احمد سرہندیؒ اور میاں میر صاحبؒ وغیرہ ہزاروں فقرا نے کیا۔ لیکن زیادہ قربانی خود بادشاہ اورنگزیب عالمگیر کو دینا پڑی کہ اسلام کی روایات قائم رکھنے کے لیے اس کو اپنا باپ اور بھائی بھی ''قربان'' کرنا پڑے۔ البتہ اہل قلم اور دانشوروں کو خوب ڈانٹ پلائی کہ انہوں نے اس کے دادا کو ''جہان

گیر" بنا دیا۔ اس کے باپ کو "شاہ جہاں" اور خود اس کو "عالم گیر" اور کنٹرول ان سے چند مرہٹے اور سکھ بھی نہیں ہو رہے۔ اور ان دنوں چین کے ملک سے ایک کتاب شائع ہوئی ہے جس کا انگریزی ترجمہ بھی ہو چکا ہے۔ اس میں سکندر یونانی سے لے کر آج تک کی دنیا کی سو مشہور ہستیوں کا ایک ایک خط نمونے کے طور پر شائع کیا گیا ہے۔ ایک خط اورنگزیب عالمگیر کا اپنے بچپن کے اتالیق کو بھی ہے کہ پڑھائی میں وہ زیادہ زور صرف ونحو اور ادبی پہلوؤں پر دیتا تھا۔ کیا ہی بہتر ہوتا کہ زیادہ زور حکمت اور فلسفہ یا جہاد کے تقاضوں پر دیتا۔ یا عملی علوم پڑھاتا کہ دشمن کے قلعہ کو کیسے سر کیا جاتا ہے۔

49۔ قارئین، ہمیں کن علوم پر زور دینا چاہیے مقصد سامنے ہونا چاہیے۔ یہ جو ایک حدیث مبارکہ کا ذکر ہوتا ہے۔ کہ علوم حاصل کرنے کے لیے چین بھی جائیں، صحاح ستہ کی کسی کتاب میں ایسی کوئی حدیث موجود نہیں۔ حضرت عمرؓ تورات پڑھ رہے تھے۔ جناب صدیق اکبرؓ نے یہ کتاب ان کے ہاتھ سے کھینچ لی "کہ اے ابن خطابؓ! ہمارے آقا ﷺ کے چہرہ مبارک کی طرف نظر دوڑائیں کہ تمہارے اس عمل سے وہاں پر کتنی خفگی ہے۔" قارئین! ہم نے کسی سے کچھ بھی نہیں سیکھنا۔ نظریات کے لیے ہمارے پاس قرآن پاک موجود ہے۔ اور ان پر عمل کرنے کے طریقوں کے لیے سنت نبوی ﷺ ہے۔ جہاں تک "ہنر" یا "فن" کا تعلق ہے تو ایمان کا ایک درجہ ہے کہ سب علوم مومن کے سامنے آ کر ہاتھ باندھ کر کھڑے ہو جاتے ہیں کہ "آؤ ہم سے استفادہ کرو"۔ صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین دنیا کے عظیم فوجی حکمت عملیوں کے ماہر جنرل، اور پیشہ ور سپاہی بن گئے۔ وہ اعلیٰ پایہ کے منتظم، معاشیات کے ماہر

اور انصاف دینے والے جج بن گئے۔ ہمارے دانشوروں کو اورنگزیب کے جانشینوں کے مشیر دانشوروں کی نقالی نہ کرنا چاہیے کہ وہ تو کمارل بھٹ کے علوم کے وارث یا ''میراثی'' بن کر ہر بادشاہ کی عمر کو ہزار برس ہونے کی نظمیں لکھ رہے تھے۔ آداب محفل کو سیکھنے کے لیے ''بازار حسن'' میں جانے یا ''کوٹھے'' والی کے گھر پر حاضری ضروری تھی۔ ایک طرف ''مبالغہ'' حد سے بڑھا ہوا تھا۔ تو لکھنؤ میں ''بانکپن'' کا مظاہرہ ہو رہا تھا۔ تو ساتھ ساتھ ''مرثیہ نوازی'' اور ''نوحہ خوانی'' معاشرہ کی ضرورتیں بن گئیں۔ اور بادشاہ محمد شاہ رنگیلے جیسے ''نازک مزاج'' تھے کہ گرمیوں میں صرف ''ململ'' اور سردیوں میں ''مخمل'' کے بغیر اور کوئی کپڑا زیب تن نہ کیا جاتا تھا۔ اسلامی سلطنت کب سے زوال پذیر تھی۔ اور 1857ء میں چاروں شانے چت گر گئی۔ تو ہمارے دانشوروں یعنی مرزا غالب وغیرہ نے

حیراں ہوں کہ روؤں کہ پیٹوں جگر کو میں

جیسے ادب کی آبیاری کرنے والوں کی ایک فوج بنالی۔

50۔ چنانچہ پاکستان جب وجود میں آیا، تو ایسی فوج کے ''جانشین'' مرزا غالب کو کبھی کراچی میں ''بندر روڈ'' پر لے جاتے تھے اور کبھی لاہور کے ''انارکلی بازار'' میں۔ اور دہلی اور اودھ کی اس تہذیب اور ثقافت کو ہمارا اوڑھنا بچھونا بنانے میں زمین و آسمان کے ''قلابے'' ملا دیئے جاتے تھے۔ ایسا ہی ایک دانشور ایوب خان کے ساتھ علی گڑھ کے ذریعہ ''ڈاکخانہ'' ملانے کی کوشش کر رہا تھا۔ تو ایوب جیسے گئے گزرے آدمی کے منہ سے بھی یہ لفظ نکل پڑے کہ وہ مردہ تہذیب اور ثقافت تھی۔ وہ ''دانشور'' اس وقت تو ایوب خان کو جواب دینے کی ہمت نہ کر سکا۔ بعد میں مجھے کہنے لگا کہ ایوب بے چارے کو

کیا معلوم ہے کہ ثقافت نہ ہونے کی نسبت مردہ ثقافت ہی بہتر ہوتی ہے۔ یعنی وہ ایک طرح سے کہہ رہا تھا کہ پاکستان کے موجودہ خطوں کی کوئی ملی جلی ثقافت بھی نہیں۔ تو میں نے گزارش کی کہ "میاں اسلام علاقائی اور معاشرتی روایتوں یا ثقافتوں کو کوئی وقعت نہیں دیتا۔ مسلمان کفار کے لیے اشدّ (سخت) ہیں اور ایک دوسرے کے لیے "رحما بینھم" ہیں۔ ان کی یہ ثقافت اور تہذیب سورۃ الفتح کے تیسرے رکوع میں خوب تر بیان ہے اور اس عاجز نے ترجمہ کے ساتھ یہ سارا رکوع اس دانشور کے سامنے پڑھ دیا۔ تو اس نے "ٹھٹھانا" شروع کر دیا۔ قارئین! اس عاجز نے اپنی قرآن پاک کی تفسیر میں سورۃ الفتح کی تفسیر انھی لائنز پر لکھی تو فیروز سنز کے مینجر آفتاب طارق کو خواب میں یہی اشارہ ہوا اور اس کو فتح مکہ کا منظر بھی خواب میں دکھایا گیا۔ تو وہ چند رفقاء کے ساتھ مجھے یہ خواب سنانے کے لیے آیا تو میں نے جب فتح مکہ کے منظر کو عین اپنی تفسیر کے الفاظ کے مطابق پایا تو مجھ پر رقت طاری ہوگئی اور ہمارا سارا گھر خوشبو کی مہک سے اس طرح معطر ہو گیا کہ باقی گھر والے جو دوسرے کمروں اور بالائی منزل پر تھے۔ خوشبو نے ان کے لیے بھی ماحول کو معطر کر دیا۔

5- ان مردہ ثقافتوں کے پیروکار دانشوروں کی اسلام میں کوئی جگہ نہیں۔ خدا بھلا کرے علامہ اقبالؒ کا کہ ع

شوکتِ سنجر و سلیم تیرے جلال کا نمود

جیسے نغمے سنا کر ہم مردہ قوم میں جان ڈالی کہ ع

نہ ہو جلال تو حسن جمال بے تاثیر

ادھر پیرا 10 میں جو ہمارے بدن سے روح محمد ﷺ نکالنے کی سازش کا

ذکر کیا، اس کا قلع وقمع کرنے کی توفیق اللہ تعالیٰ نے امام احمد رضا بریلویؒ کو عطا فرمائی۔ کہ جنھوں نے ع

مصطفیٰ ﷺ جان رحمت پہ لاکھوں سلام

کے پاکیزہ سپرے سے اس برصغیر کی سرزمین کو معطر، مطہر اور منور کردیا۔ کہ آگے پیرا 91 میں ذکر آرہا ہے کہ کچھ غازی جن کے ایک ہی عمل نے ان کو غازی اور شہید کی دونوں صفات سے نواز دیا۔ وہ دونوں عظیم جنگوں کے درمیانی عرصوں میں ناموس رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر قربان ہو گئے کہ ان میں سے ایک غازی ملک میاں محمد شہید کے مزار پر یہ الفاظ کنندہ ہیں کہ ''کیا خوب انتخاب تھا تیری حیات کا'' تو پاکستان بن جانے کے بعد ہمارے دانشوروں اور اہل قلم کو تو قرآنی علوم اور سنت نبوی ﷺ کو زمانے کے تناظر میں اس طرح ارتقا دینا چاہیے تھا جو طریقہ علامہ اقبالؒ نے اختیار کیا تھا۔ کہ علامہ اقبالؒ ایک لاثانی دانشور تھے اور ایسی شخصیت دنیا میں دوبارہ پیدا نہیں ہوسکتی۔ پروفیسر منور مرزا نے اس سلسلہ میں کچھ کام کیا لیکن علامہ اقبالؒ کا تو سارا کلام جہاد کے محور کے گرد گھومتا ہے اور اس عاجز نے اس سلسلہ میں افواج کے لیے کچھ کام کیا۔ اور اب اپنی سیرت نبوی ﷺ کی کتابوں اور تفسیر میں اپنے بیانات کی وضاحت علامہ اقبالؒ کے کلام کی مدد سے کرتا ہوں۔ لیکن ہمارے دانشوروں اور اخبار نویسوں میں سے بہت کم لوگوں نے اس ضرورت کے لیے کوئی کام کیا۔

52۔ ہمارے اہل قلم بھانت بھانت کی بولیاں بول رہے ہیں۔ مردہ مغل اور اودھ کی تہذیب کے دلدادہ اہل قلم کا کچھ ذکر تو ہو چکا ہے اور آج بھی ایسے لوگ کثرت سے ہمارے اندر موجود ہیں۔ جو گرگٹ کی طرح رنگ تبدیل

کرتے رہتے ہیں۔ اور اخباری دنیا یا انفارمیشن میڈیا کے کئی اداروں میں کئی طرح سے اپنی ''ڈفلیاں'' بجاتے رہتے ہیں۔ خاص کر جنگ اخبار میں یہ لوگ کئی واسطوں سے موجود رہے اور اب بھی ''موجود'' ہیں ان لوگوں میں کمارل بھٹ کے جانشین ''مراثیوں'' کا خوب زور ہے، جو مسلمان ہو گئے تھے۔ پاکستان بننے کے بعد ان لوگوں نے وہی کیا جس کا گلہ اورنگزیب عالمگیر کو تھا۔ ایسے ''میراثی'' سرکاری ابلاغ کے اداروں میں گھس گئے۔ پاکستان کے دنیا کے پانچویں بڑے ملک اور سب سے بڑے اسلامی ملک ہونے کے وہ ڈونگرے بجائے کہ اللہ تعالیٰ کو بھی ایسا تکبر اور غرور پسند نہیں۔ اللہ تعالیٰ کے ہاں بڑائی تقویٰ میں ہے۔ اور ویسے بھی ہماری دنیاوی ''وقعت'' نہ ہونے کے برابر تھی اور 1956ء کے وزیر اعظم سہروردی نے ٹھیک طور پر اسلامی ممالک کو ''صفر'' کا درجہ دیا اور آج بھی یہی حالت ہے۔ ویسے بددیانتی اور رشوت وغیرہ کے لحاظ سے بھی ہم دنیا کے ''بدترین ممالک'' میں شمار ہوتے ہیں۔ ان دانشوروں نے علاقائی تعصب کو بھی اپنا اوڑھنا بچھونا بنائے رکھا کہ ان میں زیادہ تر گنگا، جمنی لوگ تھے۔ جو ادب، ثقافت، ذرائع ابلاغ اور اخباری دنیا کو اپنی Monoply یا ورثہ سمجھتے تھے۔ اور ریڈیو اور بعد میں ٹی وی وغیرہ کو اپنی ''ملکیت'' قرار دیتے ہیں۔ اور وہاں کسی ''غیر'' کی موجودگی کو گوارا نہیں کرتے۔ اور ان سب ذرائع سے غیر اسلامی اور باطل نظریات بلکہ بے حیائی کو خوب پھیلاؤ دیا گیا۔ اور اسلامی اقدار کو اپنانے کے لئے کوئی بامقصد طریقہ نہ اختیار کیا گیا۔

53۔ جنگ گروپ کے اخباروں کا مالک خلیل الرحمٰن آزادی سے پہلے دہلی میں ہمارے ''شناساؤں'' میں شامل تھا۔ کہ ان زمانوں میں اس کا بھی ہماری

طرح سائیکل پر ''گزارا'' تھا۔ پاکستان میں آنے کے بعد دوسروں کی طرح وہ بھی ارب پتی بن گیا۔ اور یہ الگ کہانی ہے کہ اس ''میدان'' میں پیسہ ہی پیسہ سب کچھ ہے۔ بہرحال اس عاجز نے خلیل الرحمٰن کو کہا کہ کچھ تو خیال کرو اور اپنی اخبار سے اس طرح ''بے حیائی'' کو تو نہ پھیلاؤ۔ کہنے لگا، '' ملک صاحب دوکاندار ہوں۔ حلال بھی بیچتا ہوں اور سؤر بھی۔ اب لوگوں کو اگر حرام زیادہ پسند ہے تو وہ کیا کرسکتا ہے۔'' تو قارئین ایک اور نکتہ بھی باور کرلیں کہ سب اخبار نویس اور اخباریں ''دوکاندار'' بھی ہیں، صرف مجید نظامی نہیں مانتا۔ وہ قوم کا ''رہنما'' بنا ہوا ہے تو اس پہلو کو آگے زیر بحث لائیں گے۔ بہرحال میرے لحاظ سے اکثر اخبار نویسوں نے گمراہی پھیلائی اور اس بنیادی پہلو پر کبھی کسی اخبار نویس نے دھیان نہ دیا کہ وہ جو قلم کا تقدس قائم نہیں رکھ رہے تو روز قیامت رب سبحانہٗ کو کیا جواب دیں گے۔

میرا تعلق اخباری دنیا کے ساتھ بہت پرانا ہے۔ میرے ایک تایا جو برہما میں آباد ہوگئے تھے۔ وہ 36-1935ء میں ایک سال کے لیے ہمارے پاس قیام کے لیے آئے تو گھر میں اخباروں کے ڈھیر لگ جاتے تھے۔ اخبار ''زمیندار'' کے مالک ظفر علی خان اور اس زمانے میں بجنور کی اخبار ''مدینہ'' کے نصر اللہ عزیز (بعد میں کوثر اور تسنیم کے ایڈیٹر) میرے تایا کے عزیز دوست تھے۔ میں خود حادثہ کے طور پر 1943ء میں ISPR میں جانے کی وجہ سے اخباری دنیا کے ساتھ ''وابستہ'' ہوگیا۔ چراغ حسن حسرت، فیض احمد فیض، ن م راشد، مجید ملک، ممتاز علوی، طیب حسین، ضمیر جعفری، ایک ''انبوہ'' میرا ہم سفر اور ہم عصر رہا۔ ڈان کا الطاف حسین، کلکتہ کے اخبار سٹیٹسمین میں جونیئر کالم نویس ہوتا تھا۔ زیڈ۔ اے سلہری، حمید نظامی وغیرہ

نے ہمارے سامنے اخباری پیشہ اختیار کیا۔ پاکستان ٹائمز کا مظہر علی میری یونٹ کا تھا۔ میم شین کے بڑے بھائی غلام محمد اور سارا خاندان فوج میں ہمارے ساتھ تھا۔ اور ابن الحسن، عبدالرحمٰن صدیقی اور تفضّل وغیرہ جن کو میں ''سویلین وردی پوش'' کہا کرتا تھا، ان لوگوں کو تو وردی بھی میں نے اپنے ہاتھ سے پہنائی۔

54۔ ان سب میں ضمیر جعفری کی طرح کچھ لوگ ایسے ہیں کہ جو کسی خاص گروہ کے ساتھ وابستہ نہ رہے۔ اور ان کی تحریروں میں کچھ ''ذہنی چاشنی'' ہوتی تھی، نہ انہوں نے گمراہی پھیلائی، نہ اسلام کی کوئی خدمت کی۔ باقیوں میں سے اکثر گمراہی پھیلانے والوں کے ساتھ وابستہ رہے اور اسلام کی خدمت تو کسی ایک نے بھی نہ کی۔ اور آج تک ہمارے کسی رہنما یا دانشور نے بنیادی ضروریات کی طرف قوم کی راہنمائی نہیں کی کہ تخلیق کائنات کا مقصد کیا ہے؟ ہم کون ہیں، کہاں سے آئے ہیں؟ یہاں کیوں آئے ہیں؟ یہاں سے کہاں جا رہے ہیں؟ مومن کے مقاصد حیات کیا ہیں؟ اور ان مقاصد کو انفرادی اور اجتماعی طور پر حاصل کرنے کے لیے طریق کار کیا اختیار کریں؟ یعنی کسی صاحب نے اسلامی فلسفۂ حیات کو نہ تو قوم کے سامنے پیش کیا ہے اور نہ اپنے فلسفۂ حیات کا غیروں کے فلسفۂ حیات سے موازنہ کیا ہے۔ یہی بہت بڑا المیہ ہے کہ چودہ سو سالوں کے بعد اگر اسلام کے نام پر کوئی ملک بن رہا تھا تو اس کو باطل نظاموں کے تحت چلانا کہ مادر پدر آزاد سیاسی پارٹیاں بھی ہوں، حزب اختلاف بھی ہو اور حزب اقتدار بھی ہو، بھانت بھانت کی بولیاں بھی ہوں۔ اور زیادہ افسوناک بات یہ ہے کہ ہماری اخباری دنیا میں زیادہ تر بے دین لوگ آ گئے۔ جن میں کچھ تو

اپنے آپ کو ''لبرل'' گردانتے ہیں اور ماڈرن اسلام کے چکر میں ہیں۔ حالانکہ علامہ صاحب فرما گئے تھے۔

زمانہ ایک حیات ایک کائنات بھی ایک
دلیل کم نظری قصہ جدید و قدیم

اسلام کے لحاظ سے'' دانشور'' وہ ہے جو اللہ تعالیٰ سبحانہٗ اور رسول پاک صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بتائے ہوئے صراط مستقیم کی صحیح نشاندہی کرے۔ حضور پاک صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی بعثت سے پہلے مکہ مکرمہ کے شرفا میں سے عمرو بن ہشام کو ابوالحکم (دانائی کا باپ) کہا جاتا تھا۔ اب ہم اس کو ابوجہل (جہالت کا باپ) کے طور پر جانتے ہیں۔ پاکستان بن جانے کے بعد ایک ایسی لائن لگانے کی ضرورت تھی کہ اسلام دشمنوں اور الحاد کے پرچار کرنے والوں کو گھاس نہ ڈالی جاتی۔ لیکن تماشہ یہ ہے کہ الحاد کا بڑا مبلغ اور پاکستان کو گالیاں نکالنے والا جوش ملیح آبادی بھی پاکستان پہنچ گیا۔ اور اب اس کے مرجانے کے بعد یہاں اس کی برسیاں منا کر اس کو خراج تحسین پیش کیا جاتا ہے۔ ایک ایسی ہی برسی کے موقع پر ضیاء الحق نے بھی پیغام بھیجا تو میں نے ضیاء الحق کو خط لکھا تھا کہ اگلی دفعہ ابوجہل کی ایک ایسی برسی منانے کا بندوبست کیا جائے۔ (توبہ میرے اللہ)۔ برسیاں مناتے وقت اگر توبہ وندامت کی جائے اور کسی صاحب کیلئے خاص کر مغفرت کی دعا کی جائے تو یہ طریقہ تو ٹھیک ہے۔ لیکن یہاں یہ ہوتا ہے کہ گمراہ لوگوں کی برسیاں منا کر ان کو خراج تحسین پیش کیا جاتا ہے۔ یا کسی ''دانشور'' کی برسی منائی جاتی ہے، جیسے نوائے وقت والے حمید نظامی کی برسی مناتے ہیں۔ جہاں کچھ لوگ ''دروغگوئی'' یا ''مبالغہ'' کر کے باطل

فلسفہ جمہوریت یا مادر پدر آزادی کے سلسلہ میں کام کرنے کے بارے حمید نظامی کے نام کو اس طرح ''چار چاند'' لگاتے ہیں کہ یہ باطل فلسفے ہمارے ایمان کا حصہ ہیں اور حمید نظامی اس سلسلہ میں ہمارا ''رہنما'' تھا۔ان خود ساختہ دانشوروں کے سامنے بڑا مقصد یہ ہوتا ہے کہ ان کا نام اور فوٹو اخبار میں آجائے۔اب ''جنگ'' اخبار والوں نے یہی سلسلہ خلیل الرحمٰن کے بارے شروع کر دیا ہے۔جو خود تسلیم کرتا تھا کہ وہ ''دکاندار'' ہے اور حلال و حرام دونوں کو ''فروخت'' کرتا ہے۔اب جو لوگ قلم کا تقدس نہیں رکھتے اور قلم سے گمراہی پھیلاتے ہیں،ان کے بارے حضور پاک صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فرماتے ہیں کہ دوزخ کی طرف عرب کا مشہور شاعر امرو القیس ان کی رہنمائی کرے گا۔لیکن ہمارے ہاں بدقسمتی سے دانشوروں کا ایک اور طبقہ بھی ہے جو سورۃ النساء کی آیت مبارکہ 143 کے مطابق ''نہ ادھر کے ہیں نہ اُدھر کے''۔اس سلسلہ میں اختصار کے مدنظر صرف تین آدمیوں کا ذکر کروں گا۔اول ''چرب زبان'' اسرار احمد ہے جو ''ڈاکٹر'' بھی ہے۔سورۃ الذاریت کی آیت مبارکہ 8 کے مطابق بھانت بھانت کی بولیاں بولنے کا ماہر ہے۔بزرگوں کی بے ادبیاں اور گستاخیاں اس کا تکیہ کلام رہا،اور اس نے خوب تفرقے پھیلائے۔لیکن وہ بھی اپنی شخصیت کے گرد ایک ''قلعہ'' تعمیر کر چکا ہے اور آج کل پینترا تبدیل کر کے روحانیت کو اپنا اوڑھنا بچھونا بنا رہا ہے۔دوسرا طاہر القادری ہے جس کو ہمارے علاقے کے لوگ ''میراثیوں کے پیر'' کے نام سے گردانتے ہیں۔وہ کبھی تو گھوڑے کا ''شاہسوار'' بنا ہوتا ہے اور کبھی گدھے پر بھی صرف ''لٹک'' رہا ہوتا ہے۔بڑی خط و کتابت رہی کہ اپنی ''ولایت'' کے قلابے جا کر آسمان سے

ملائے، اور وہاں سے کیچڑ میں بھی کئی دفعہ گرا۔لیکن پھر بھی ایک بہت بڑی ''سلطنت'' کا مالک ہے۔تیسرا حنیف رامے ہے، جو ملک کے سب سے بڑے صوبے کا وزیراعلیٰ بھی بن گیا۔ جو آج کل بیمار ہے، خدا خیر کرے۔

55۔ یہ بے دین دانشوری کا لبادہ اوڑھنے والے، حکومتی اداروں سمیت ہر جگہ گھسے ہوئے ہیں۔ایک ان کا اپنا ادارہ ہے جس کو یہ لوگ ''ترقی پسند'' کہتے ہیں۔قدرت اللہ شہاب نے ایوب خان سے جو''رائیٹر گلڈ'' بنوایا، یہ لوگ وہاں بھی ''گھس'' گئے۔ روٹری اور لائن کلب یا غیروں کے کئی ادارے جنھوں نے کئی ''لبادے'' اوڑھے ہوتے ہیں، وہ ایسے لوگوں کی ''تلاش'' میں ہوتے ہیں۔ اکثر کئی ''لسٹیں'' شائع ہوتی رہتی ہیں کہ'' فلاں''، ''فلاں ادارے'' کا ''تنخواہ دار'' ہے یہ کچھ بھی ایسے لوگوں کو'' متوجہ'' کرنے کے لیے ہوتا ہے کہ میدان بڑا وسیع ہے۔ کہ تم کچھ نہ سے ''بہت کچھ'' بن سکتے ہو۔ایسے ہی ایک ادارے کا معمولی ٹرانسلیٹر زاہد ملک آج کئی اخباروں کا مالک ہے۔آج سے تقریباً دس سال پہلے ہمدرد ادارے کی ایک میٹنگ میں اس کو'' مہمان خصوصی'' کے طور پر بلایا گیا۔اور آج جو اسرائیل کو تسلیم کرنے کی باتیں ہورہی ہیں، یہ کچھ زاہد ملک نے اس زمانے میں کہہ دیا کہ پاکستان کے لیے بہتر یہی ہے کہ وہ جتنا جلد ہو سکے اسرائیل کو تسلیم کر لے۔ میں نے اٹھ کر کہہ دیا کہ'' بکواس بند کرو'' اور حکیم سعید کو کہا کہ کیا اس نے ہمیں ایسے'' بکواسات'' سننے کے لیے بلایا تھا۔اور وہاں کافی جھگڑا شروع ہو گیا۔ مرحوم جنرل فضل مقیم اس زمانے میں زندہ تھے اور میٹنگ میں موجود تھے۔ انہوں نے میری منت کر کے مجھے کچھ ٹھنڈا کیا اور اس کے بعد میں نے ہمدرد کی میٹنگوں میں جانا چھوڑ دیا۔ دراصل ان اہل

قلم یا دانشوروں کے سیمینارز یا میٹنگوں میں اس عاجز کو ذرا کم ہی بلایا جاتا ہے۔ لیکن اگر میں کسی جگہ پہنچ جاؤں تو پھر میں لگی لپٹی نہیں رکھتا۔ خیر موقع کی تلاش ہوتی ہے۔ اور کوئی مقرر اگر ذرا کسی باطل طرف پھسلتا ہے تو پھر میرے لیے بہانہ بن جاتا ہے۔ اور ویسے بھی یہ عاجز یہ سب کو یاد کرا دیتا ہے کہ ایک دن انہوں نے رب سبحانہ' کو جواب دینا ہوگا۔

56۔ البتہ افسوسناک پہلو یہ ہے کہ ''اسلام پسندے'' یا اسلام کا لبادہ اوڑھنے والے اسلامی دانشوروں یا اہل قلم کی کوئی تنظیم نہیں بنا سکے۔ اور خود ان کی تعداد آٹے میں نمک کے برابر ہے۔ اب لطف کی بات ہے کہ جماعت اسلامی کی اخبار جسارت میں جو لوگ کام کرتے ہیں۔ ان کے علاقائی اور'' گنگا جمنی'' تعصب کا یہ حال ہے کہ جب جوش ملیح آبادی مرا، تو یہ خبر پہلے صفحہ پر چھ کالم میں تھی۔ اور حفیظ جالندھری نے جو اس کے مرنے پر بہت پیارا تبصرہ کیا کہ کاش چند دن اور زندہ رہتا۔ اور توبہ کر کے مرتا۔ وہ تبصرہ ان ''گنگا جمنی'' لوگوں نے شائع نہ ہونے دیا۔ اور جب عاشق رسول ﷺ حفیظ جالندھری کی وفات ہوئی تو چونکہ اس کا تعلق پنجاب سے تھا تو جسارت میں یہ خبر اندر کے ایک صفحہ پر چند الفاظ میں ایک کالم میں تھی۔ اس زمانے میں صلاح الدین ایڈیٹر تھا۔ وہ مجھے ملا تو میں نے اس کو واضح کیا کہ اس کے سٹاف والے کتنے صوبائی تعصب کا شکار ہیں تو صلاح الدین نے اس کو تسلیم کیا۔ صلاح الدین اور مجھ میں ایک قدر مشترک تھی کہ ذوالفقار بھٹو اور پیپلز پارٹی سے کسی خیر کی توقع نہیں ہو سکتی۔ لیکن جب مصلحت میں آ کر جماعت اسلامی نے پیپلز پارٹی کے ساتھ پینگیں اڑانی شروع کر دیں تو صلاح الدین کو جماعت اسلامی کی اخبار جسارت چھوڑنا پڑی۔ اور اپنی

ایک ہفتہ وار اخبار نکالنے کا بندوبست کیا۔ لیکن گنگا جمنی کے متعصب گروہ بھی صلاح الدین کو اپنے راستے کا ایک روڑا سمجھتے ہیں۔ تو انہوں نے صلاح الدین کو ''منظر'' سے ہٹا دیا۔ اور اس طرح ملت اسلامیہ، اسلام کے ایک عظیم فرزند کی خدمت سے محروم ہوگئی۔

57۔ اسلام کا لبادہ اوڑھنے والا الطاف حسن قریشی بھی ''دانشور'' بنا ہوا ہے۔ اور 1967ء میں وہ مجھے ''بلیک میل'' کر کے فوج میں ''مودودی کے اسلام'' کے پرچار کی راہ نکالنا چاہتا تھا۔ میں نے اسے گھاس نہ ڈالی تو میرے ماتحت صدیق سالک کو جو اس وقت کیپٹن تھا، کوشہ دی کہ اس میجر کو گھر بھجوا کر سالک کو اس جگہ پر لایا جائے۔ لیکن اس عاجز نے ان زمانوں میں جو'' وقعت'' حاصل کر لی تھی، الطاف کے ہتھکنڈے میرا کچھ نہ بگاڑ سکتے تھے۔ کہ فوج والوں نے میری یہ تبلیغ تہہ دل سے قبول کر لی تھی کہ فوجی سپاہی عشق رسول ﷺ سے لبریز میدان جنگ میں داخل ہوتا ہے۔ اگر روح محمد ﷺ اس کے بدن سے نکال لیں تو وہ مجاہد نہیں رہتا۔ ایک عام سپاہی بن جاتا ہے۔ اس لیے فوج میں مودودی کی تحریروں کو پذیرائی نہیں ملنا چاہیے۔ لیکن میری فوج سے ریٹائرمنٹ کے بعد ضیا الحق نے مودودی کی ''تفہیم'' کو فوج میں پذیرائی دے دی۔ لیکن اس وقت ہمارے جاننے والوں اور ہم خیال لوگوں کا فوج میں ایک ''انبوہ'' موجود تھا۔ ہم نے جگہ جگہ جوانوں کو حقیقت اور تلخ حقائق سے آگاہ رکھنے کو اپنے اوپر فرض کر دیا۔ اور اب تو پیرا نمبر 18 میں ذکر ہو چکا ہے کہ اس سلسلہ میں ایک کتاب بھی لکھی جا چکی ہے جسے اہل ایمان نے ہاتھوں ہاتھ لیا۔

58۔ سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ پاکستان میں ''کونسا'' اسلام نافذ ہو۔ ہمارے لحاظ

سے یہ علامہ اقبالؒ اور قائداعظم کا اسلام ہے۔ جس میں نہ فرقہ داری ہے نہ فقہی گروہ بندی اور پیراگراف نمبر 25 میں ہم ثابت کر آئے ہیں کہ یہ سب کچھ ''کم علمی'' یا ضد کا نتیجہ ہے اور اس سلسلہ میں کسی مقام پر بحث کے لیے تیار ہیں اور وہاں جو شیعہ سنی اختلافات کے نہ ہونے کی کچھ تفصیل لکھنے کا وعدہ کیا تھا، وہ یہ ہے کہ تاریخی طور پر ثابت ہے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ اور اصحاب ثلاثہ رضی اللہ عنہم میں کوئی اختلاف نہ تھا۔ دو دفعہ جب حضرت عمر رضی اللہ عنہ ملک شام کی طرف گئے تو خلافت کی ذمہ داری حضرت علیؓ کو سونپ گئے۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے اپنے بیٹوں کے نام ابو بکرؓ، عمرؓ اور عثمانؓ کے اسما پر رکھے اور بیٹوں کے نام کسی پیاری روایت کے تحت رکھے جاتے ہیں۔ البتہ امیر معاویہ کا معاملہ بہت زیادہ چھان بین کی دعوت دیتا ہے۔ اول امیر معاویہ کی حضرت علیؓ کے خلاف بغاوت کا واضح ثبوت حضرت عمارؓ کی جنگ صفین میں شہادت سے مل جاتا ہے۔ جس کی ہمارے آقا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پیش بینی فرما گئے تھے۔ اور اسلام میں تمام تفرقات کے تانے بانے امیر معاویہ کی خلافت کی ''چاہت'' کے اردگرد باندھے جاسکتے ہیں۔ چنانچہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی شہادت بنوامیہ اور خاص کر ''امیر معاویہ'' کی ضرورت تھی کہ حضرت عثمانؓ کو ''مظلوم'' ثابت کر کے وہ خلافت حاصل کر سکیں۔ اس کے برعکس امیر معاویہ اور بنوامیہ والے لگاتار کوشش میں تھے کہ حضرت عثمانؓ کی شہادت کی تمام تر ذمہ داری حضرت علیؓ پر ڈال دیں کہ ان کو خلافت کی چاہت ہے اور وہ حضرت عثمانؓ کو اپنے راستہ سے ہٹانا چاہیں گے۔ (توبہ میرے اللہ)۔

59۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ کو روحانی طور پر سب آگاہی تھی کہ امیر معاویہ،

مروان اور بنوامیہ والے کس طرح کی سازشوں سے حضرت علیؓ کو بدنام کر رہے تھے۔ حالانکہ ان کو معلوم تھا کہ ان کی اولاد جو اولاد رسول ﷺ بھی ہے، رب سبحانہٗ ان کو دنیاوی حکومتوں سے ''داغدار'' نہ کریں گے۔ تو حضرت علیؓ بھی حکومت سے دور رہنا چاہتے تھے۔ اور سازش نے جب مدینہ منورہ میں زور پکڑا، تو جناب سعدؓ بن ابی وقاص، حضرت علیؓ کے پاس آئے اور ان کو مشورہ دیا کہ ایسے نظر آتا ہے کہ سازشی حضرت عثمانؓ کو شہید کر دیں گے۔ اس لیے بہتر ہے حضرت علیؓ مدینہ منورہ سے چلے جائیں۔ ورنہ شہادت کا سارا الزام ان پر تھونپ دیا جائے گا۔ جناب حیدر کرارؓ مسکرادیئے اور فرمایا کہ اگر آج سے دو سال پہلے وہ مدینہ منورہ چھوڑ چکے ہوتے تو بھی سارا الزام ان پر تھونپ دیا جاتا۔ وہ حضرت عثمانؓ کو مشورہ دے کر حالات صحیح کراتے ہیں۔ لیکن حضرت عثمانؓ کو بنوامیہ والوں نے اس طرح گھیرے میں لیا ہوا ہے کہ عملی طور پر وہ ہوتا ہے جو کچھ یہ ''سازشی'' چاہتے ہیں۔ یہ لوگ ایک طرف حضرت عثمانؓ کے ''محافظ'' بنے ہوئے ہیں۔ دوسری طرف وہ حضرت عثمانؓ کو شہید کرا کے مظلوم کے طور پر پیش کرنا چاہتے ہیں کہ حکومت پر وہ براجمان ہو جائیں۔

60۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کو مشورہ دیا کہ وہ صوبائی گورنروں یا عاملوں کو بلا کر مشورہ دیں کہ وہ لوگوں کی شکایات سنیں اوران کے علاقوں کے لوگ شور مچاتے مدینہ منورہ نہ پہنچیں کہ وہ یہاں آ کر دنگہ وفساد مچاتے ہیں۔ امیر معاویہ سمیت سب گورنر آئے۔ اور جب واپس جانے لگے تو امیر معاویہؓ نے حضرت علیؓ اور حضرت زبیرؓ کو مخاطب ہو کر کہا کہ وہ اس ''بوڑھے'' (یعنی حضرت عثمانؓ) کو ان کی حفاظت میں چھوڑ کر جا

رہے ہیں۔ جناب زبیرؓ ذرا جذباتی ہو گئے اور ان کے آنسو آ گئے کہ وہ سازش کو نہ سمجھتے تھے۔ لیکن ''علم کے شہر ﷺ'' کے ''علم کے دروازے'' نے امیر معاویہ سے پوچھا'' اے ابن ابوسفیان! تم اس بوڑھے کے ''وارث'' کب سے بنے ہو؟ یہ تو ہمارے ساتھ تھا اور تم اور تمہارے خاندان والے اس پر اور ہم پر حملے پہ حملہ کر رہے تھے، اب کیسی حفاظت؟ اور کس سے حفاظت کی بات کرتے ہو۔'' قارئین! باتیں بہت ہیں۔ سازش بڑی گہری تھی۔ لیکن اختصار میری مجبوری ہے۔

61۔ اب دیکھیں کہ تین صوبوں، بصرہ، کوفہ اور مصر سے ''شر پسند یا سازش کے کرتا دھرتا'' ایک ہی وقت میں مدینہ منورہ پہنچ جاتے ہیں۔ اور امیر معاویہ ایک ''حفاظتی دستہ'' دمشق سے بھیجتا ہے جو آ کر مدینہ منورہ کے شمال میں ''قیام پذیر'' ہو جاتا ہے۔ حضرت علیؓ، حضرت عثمانؓ کے ساتھ بات کر کے تینوں صوبوں کے ''شر پسندوں'' کی ڈیمانڈز حضرت عثمانؓ سے منظور کرا کے ان کو اپنے صوبوں میں واپس بھجوا دیتے ہیں۔ لیکن حضرت عثمانؓ کی مہر والا خط کہ ان کی ڈیمانڈ نہ مانی جائے تو مصر والے قافلہ نے ''پکڑا'' جو مغرب کی طرف سفر کر رہے تھے۔ اور وہ دو دن بعد پھر مدینہ منورہ پہنچ گئے۔ لیکن حیرانگی کی بات ہے کہ مشرق کی طرف بصرہ اور کوفہ والے قافلے بھی اسی دن مدینہ منورہ پہنچ گئے۔ حالانکہ اس دن ان کو مدینہ منورہ سے مشرق کی طرف چار دنوں کے سفر پر ہونا چاہیے تھا۔ پھر کیا ہوا، مدینہ منورہ میں کیا ''ہڑ بونگ'' مچی۔ لیکن مروان جس کی شرارتیں واضح تھیں وہ کیسے بچ گیا۔ امیر معاویہ کا لشکر مدینہ منورہ کے شمال میں بیٹھ کر صرف ''تماشا'' دیکھنے آیا تھا کہ حضرت عثمانؓ کی شہادت کے بعد واپس دمشق چلا گیا۔ اور کسی

''شر پسند'' پر ہاتھ نہ ڈالا۔

62۔ پھر حضرت علی رضی اللہ عنہ کو خلافت کا بوجھ اٹھانے پر کیوں مجبور کیا گیا کہ وہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے جانشین بنیں کہ ان پر حضرت عثمانؓ کی شہادت میں شمولیت کا الزام لگایا جائے۔ اور حضرت علیؓ نے یہ کچھ اسلام کے مرکز کو سہارا دینے کے لیے کیا۔ کہ اسلام پاش پاش نہ ہو جائے۔ پھر مروان کس طرح حضرت علیؓ کی بیعت کرنے والوں کو مکہ مکرمہ لے گیا۔ جناب عبداللہؓ بن زبیرؓ کی خلافت کی ''چاہت'' کی وجہ سے ان کو ''بلیک میل'' کیا گیا۔ اور ان کے ذریعہ سے جناب عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کی غلط رہنمائی کی۔ اور جنگ جمل مکمل طور پر مروان کی سازش کی ''پیداوار'' ہے۔ حضرت علیؓ مشیت کے آگے بھی مجبور تھے کہ جب جنگ جمل میں شمولیت کرنے والے کو چھوڑ رہے تھے کہ باقیوں کو رہا کر دیا۔ اور یہی مروان وہاں سے دمشق پہنچ گیا۔ اور امیر معاویہ کے ساتھ مل کر اسلام کی اس پہلی سازش یا ''المیہ'' کو پروان چڑھایا۔ ایک ایک واقعہ سے حضرت علیؓ کی شان کی بلندی عیاں ہوتی ہے۔ کہ جب لوگوں پر واضح ہوا کہ جناب علیؓ کے ساتھ انصاف نہ ہوا تھا اور امیر معاویہ نے ان کے ساتھ بہت زیادتیاں کیں۔ تو امیر معاویہ کے ''زرخیز ذہن'' نے ایک اور شوشہ چھوڑا کہ اصحاب ثلاثہؓ نے بھی جناب علیؓ کے ساتھ ''زیادتیاں'' کیں اور جماعت والے سال (سنۃ و جماعت) کے مصلحتی اسلام کا سربراہ بن گیا۔ جو بعد میں ''اہل سنت و جماعت'' کا گروہ بن گیا۔ اور حضرت علیؓ کو حق کہنے والے گروہ (شیعان علیؓ) سے اصحاب ثلاثہؓ کو ان کے اعلیٰ مقامات سے اٹھوا کر اپنے ساتھ والے ''مقام'' پر لے آیا۔ اور بھی بہت باتیں ہیں اور بہت شوشے

چھوڑے گئے اوراس عاجز کی تحقیقات کا مضمون جس کے لفظ لفظ کے لیے واقعاتی ثبوت موجود ہیں کئی کتابوں کا مضمون ہے۔

63- رہ گیا امامت کے فلسفہ پر اختلاف تو اس سلسلہ میں اہل تشیع از خود کئی گروہوں میں بٹ گئے ہیں۔زیادہ جھگڑا ''ظاہرامام'' اور ''غائب امام'' کا ہے۔اس کا تعلق ''وقت'' کے ساتھ ہے۔تو آؤایک ایسا امام تلاش کریں جو'' ظاہر'' بھی ہو اور ''غائب'' بھی ہو۔ اور وہ ہمارے آقا حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہیں۔

''ہے وہی تیرے زمانے کا امام برحق
جو تجھے حاضر و موجود سے بیزار کرے۔''

حضور پاک ﷺ ہروقت ہرجگہ ہیں اور جس طرح اللہ تعالیٰ کی ربوبیت زمان پر حاوی اور موجود ہے۔اسی طرح ہمارے آقا ﷺ کی رحمت ہروقت ہرجگہ موجود ہے۔(سورۃ الانبیا، آیت مبارکہ 107) اورسورۃ الحجر کی آیت مبارکہ 88اورسورۃ الشعرا کی آیت مبارکہ 215 کے مطابق تمام مومنین ہروقت ہرجگہ آپ ﷺ کے بازوؤں کے نیچے ہیں۔آؤسب فرقہ بندیوں اورگروہ بندیوں سے توبہ کر کے اول اورآخر مسلمان اور مومن بنیں۔اوران دونوں میں بھی فرق سمجھ لیں۔مسلمان بننا زبانی وعدہ ہے۔مومن دل اور باطن کی بات ہے۔ قرآن پاک میں اللہ تعالیٰ نے سورۃ النساء آیت مبارکہ 141اورسورۃ الروم آیت مبارکہ 47 میں صرف مومنین کی مدداورغلبہ کا وعدہ فرمایا ہے۔یہ عاجزاوراس کے رفقاءاس سلسلہ میں بہت تحقیق کرچکے ہیں۔اوراس عاجز نے کئی خطوط کے ذریعہ سے دینی سیاسی جماعتوں کے سربراہوں کوشرمندہ کیا کہ وہ لوگ ایک امام کے پیچھے نماز نہیں پڑھ سکتے،

قوم میں خاک وحدت پیدا کریں گے تو اب ان کو کچھ شرم آئی ہے تو نماز اکٹھی پڑھ لیتے ہیں۔

64۔ قارئین ہمارے دانشوری کا لبادہ اوڑھنے والوں یا خود ساختہ علماء نے اس سلسلہ میں کوئی کام نہیں کیا۔ لیکن انگریزی اخباریں اور ان کے صحافیوں کو تو پاکستانی مسلمان کہنے میں بھی جھجک آتی ہے۔ ان اخباروں کو پڑھ کر آدمی مشکل میں پڑ جاتا ہے کہ کیا یہ کسی مسلمان قوم کی اخباریں ہیں؟ یہ تو ماڈرن اسلام والے مراتب یافتہ طبقہ اور اعلیٰ سرکاری افسران یا تجارت پیشہ طبقہ یا بین الاقوامی دنیا میں اہل مغرب سے مرعوب لوگوں کی اخباریں ہیں۔ آزادی کے بعد پاکستان کو ''لٹل یورپ'' بنانے والا ایک طبقہ سامنے آیا جن کے سولین لوگ زیادہ تر ''ٹیل کوٹوں'' اور یورپین لباسوں میں ملبوس رہتے ہیں۔ اور فوجی لوگ منکی جیکٹ اور بلیو پٹرول وغیرہ جیسے لباسوں میں ہوتے ہیں۔ تو ہماری یہ انگریزی اخباریں ان لوگوں کی ہیں۔ پرانے زمانے میں ان کے لکھنے والوں میں فیض احمد، مظہر علی، احمد علی، اے ایس بی جعفری، الطاف گوہر اور زینو وغیرہ جو کچھ لکھتے تھے ان کا ہمارے بنیادی مسائل سے دور کا بھی واسطہ نہ ہوتا تھا۔ آج کل بھی ٹیڑھی گردن والا امتیاز عالم یا ایم بی نقوی یا شیریں مزاری یا کرنل آئی حسن وغیرہ اس سلسلہ میں جو کچھ لکھتے ہیں۔ یہ انہی ''لٹل یورپ'' والوں کی ذہنی عیاشی کیلئے ہوتا ہے۔ افسوسناک بات یہ ہے کہ اردو جرنلزم کی مدد سے جو یہ ترقی اور دولت جنگ اور نوائے وقت نے حاصل کی تو انہوں نے بھی جا کر انگریزی جرنلزم کو اپنی ضرورت سمجھ کر انگریزی کی اخباریں نکال لیں۔ جنگ والے چونکہ ''تھالی کے بینگن'' ہیں۔ ان کی تو انگریزی کی اخبار بھی کامیاب ہو گئی۔ لیکن نوائے

وقت کا انگریزی اخبار گھاٹے میں ہے کہ نوائے وقت والوں کا ''مزاج'' انگریزی نہیں۔ بہر حال یہ انگریزی میں اخباریں نکالنا کوئی قومی خدمت ہر گز نہیں۔

65۔ اصل بات کی طرف نہ ہماری کوئی حکومت متوجہ ہوئی نہ کوئی خود ساختہ عالم اور نہ کوئی دانشوری کا لبادہ اوڑھنے والا، کہ سوچا جاتا کہ کم علمی کی وجہ سے انیسویں صدی سے امت محمدی ﷺ کس عذاب میں گرفتار ہے اور کیسی ذلت سے دوچار ہے۔ جواب قرآن پاک سورۃ الصّف کی آیات مبارکہ 10 اور 11 میں مل جاتا ہے کہ فرمان الٰہی ہے۔ ''اے ایمان لانے والو! کیا میں تمہیں وہ تجارت بتادوں جو تمہیں دردناک عذاب سے نجات دیدے۔ اللہ تعالیٰ سبحانہٗ اور اس کے رسول پاک صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر ایمان رکھو اور اللہ تعالیٰ کی راہ میں اپنے مال اور جان سے جہاد کرو۔'' کیا پچھلے 58 سالوں میں کسی نے اس ''فکری محاذ'' پر کام کیا ہے۔ علامہ شبلی نے جہاد کو ''بظاہر ظالمانہ'' عمل قرار دے دیا۔ سید سلمان ندوی نے سیرت النبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر سات جلدیں جو لکھیں تو نظریہ جہاد کو کل چار صفحات دیئے اور مودودی کی کتاب ''جہاد فی الاسلام'' تو اسلام کے ساتھ بہت بڑا مذاق ہے کہ جہاد کو بے جان اعمال ''مصلحانہ دفاع'' اور ''مدافعانہ دفاع'' تک محدود کر کے تلوار کے ساتھ نفرت پیدا کی۔ اب اہل قلم اور علماء نے تو جان و مال کی قربانی سے وہ جہاد یا طریقہ تلاش کرنا تھا جو ہمیں اس عذاب سے نجات دیتا۔ جس میں ہم گرفتار تھے اور ہیں۔ کہ اس سلسلہ میں ہمارے آقا ﷺ کا فرمان مبارک ہے کہ مومن جہاد میں مصروف رہتا ہے۔ وہ نہ ہو تو جہاد کی تیاری میں مصروف رہتا ہے۔ اور وہ بھی نہ ہو تو سوچتا

ہے کہ جہاد کے سلسلہ میں کیا عمل کروں۔ اور جنگ از خود کو رحمت للعالمین صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے جہاد اصغر قرار دیا۔ جنگ کے لیے تیاری کو جہاد اکبر قرار دیا۔ اور قارئین بات ساری اس تیاری کی ہے کہ جہاد مومن کے لیے طرز زندگی ہے اور اپنی زندگی کو جہاد کے تقاضوں کے تابع کرنا پڑتا ہے۔ بیان ہو چکا ہے کہ رب کی ذات پاک نے کشمیر میں جہاد اصغر کے راستے کھول دیئے تھے کہ باقی پاکستان میں ہم جہاد اکبر کو اپنائیں۔ لیکن غیروں کی سازش کے تحت دسمبر 1948ء میں جہاد اصغر کو بھی جمود دے دیا گیا۔ اور فکری محاذ کی طرف تو ذرا بھر بھی پیش رفت نہ ہوئی کہ کوئی اہل قلم اس سلسلہ میں کوئی کام کرتا۔ اللہ تعالیٰ نے ہمیں اس سلسلہ میں جو سعادت عطا فرمائی اس کا ذکر آگے آ رہا ہے کہ 1969ء میں سردار عبدالقیوم نے جو تحریک المجاہدین شروع کی اس کا مسودہ بھی برادرم کرنل شیر محمد مرحوم ومغفور نے تیار کیا تھا۔ (بحوالہ پیرا93 اور 94) اور اس کی نشر واشاعت کا کام اس عاجز کے سپرد تھا۔ لیکن سردار قیوم کو تو صرف شہرت چاہیے تھی کہ صدارت حاصل کر لے اور وہ ہمیں اس میدان میں ''اکیلا'' چھوڑ کر سیاست کی سنہری کانوں سے مال حاصل کرنے کی تگ ودو میں مصروف ہو گیا۔

66۔ یہی بڑا قومی المیہ ہے کہ فکری طور پر ہم نے قوم کے لیے اس جہاد میں ''نشان راہ'' نہ تلاش کیا۔ اور جہاد کے تقاضے پورے کرنے کے لیے اسلامی فلسفہ حیات کے عملی پہلو میں نہ جھانکا۔ حالانکہ ہمارے لیے حضرت عمر رضی اللہ عنہ اور حضرت علی رضی اللہ عنہ کے اسلام میں عملی مثالیں موجود تھیں کہ مدائن کی فتح کے بعد جو ایک بہت لمبی چوڑی قالین مدینہ منورہ

پہنچی تو حضرت علی رضی اللہ عنہ کے مشورہ سے حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اس قالین کو چھوٹے چھوٹے ٹکڑوں میں کاٹ کر صحابہ بدر کے گھروں میں بانٹ دیا۔ کہ دنیاوی زینتوں کی اسلام میں کوئی جگہ نہیں۔

لیلٰی بھی ہم نشین ہو تو محمل نہ کر قبول

یہ مشیّت تھی کہ حضرت عمرؓ اور حضرت علیؓ کا اسلام پوری امت میں پوری طرح نافذ نہ ہو سکا۔ اگر ایسے ہو جاتا تو یہی عالم خلق، عالم امر کی طرح بن جاتا اور رب سبحانہٗ کا امتحان والا معاملہ ختم ہو جاتا۔ اس لیے امیر معاویہ کا ''مصلحتی اسلام'' رائج ہو گیا۔ لیکن مادیت کی اس طرح، غلامی کی اسلام میں ہرگز اجازت نہیں۔ جس طرح غیروں کے باطل فلسفوں کی بنیاد ہی ''حب الدنیا'' پر ہے اور ہم بھی غلطی سے ''فلاحی مملکت'' کے نعروں کے تحت ''جنت ارضی'' کے حصول میں لگے رہتے ہیں۔ کہ مال و دولت کے ڈھیر لگا رہے ہیں۔ اور غیروں کی نقل میں مادیت کے غلام بنتے جا رہے ہیں۔ جس سلسلہ میں قرآن پاک کی سورہ الاعراف کی آیت مبارکہ 176 میں اشارہ ہے کہ رب کی ذات پاک نے انسان کے لیے روحانی رفعتوں کی نشاندہی فرمائی لیکن وہ ''ارض'' یا مادیت میں گھس گیا۔ اور اس کی مثال کتے کی طرح ہے بوجھ رکھو تو بھی ہانپے، بوجھ نہ رکھو تو بھی ہانپے۔ حضور پاک ﷺ کی بعثت پر قریشِ مکہ اور دیگر قبائل بھی یہ ڈیمانڈ کرنے لگے کہ ہمارے ملک میں اس طرح چشمے اور نہریں ہوں، جیسے ملک عراق اور شام میں ہیں کہ ہم خوب پیداوار حاصل کر کے امیر بن جائیں۔ تو رب سبحانہٗ نے سورۃ القریش میں فیصلہ سنا دیا کہ وہ ذاتِ پاک جنگل اور جوع کو بھی رزق سے مالا مال کر سکتا ہے اور وہاں امن و امان بھی مہیا کر سکتا ہے۔ تو بات

زیادہ رزق کے حصول کی نہیں۔ رویہ اور عقیدہ کی ہے کہ رب سبحانہ' کی
امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے آگے سر خم کر کے اس ذات پاک کی
ربوبیت کو اپنے اوپر حاوی کر دیں اور ہر عمل سے پہلے دیکھیں کہ روز قیامت
اس ذات پاک کو کیا جواب دیں گے۔

67۔ اب ضرورت تو یہ تھی کہ ہمارے دانشور اور عالم مکی سورتوں سے جہاد بالنفس
یعنی ذاتی تربیت کے احکام کو ہر زاویہ اور ہر سطح کے لیے تلاش کرتے۔ او
مدنی زندگی میں جو رحمت للعالمین صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے تنظیم کی بنیا
ڈالی کہ عقد مواخاۃ سے ہمیں بھائی بھائی بنا دیا (کل مسلم اخوۃ) اور ہر سطح
امیر مقرر فرما کے ہمیں رابطوں میں باندھ دیا کہ مدنی سورہ آل عمران کی
آیت مبارکہ 200 کے مطابق یہ رابطہ اللہ تعالیٰ سے ڈر کر کے صبر
مصابرہ کر کے باندھا گیا۔ کہ سورہ المائدہ کی آیت مبارکہ 56 او
سورۃ المجادلہ کی آیت مبارکہ 22 کے مطابق ہم ''حزب اللہ'' یعنی اللہ تعا
کی فوج بن گئے کہ سورۃ الانفال کی آیت مبارکہ 63 کے مطابق اللہ تعا
نے ایسی الفت سے ہمارے دلوں کو جوڑ دیا کہ ہم سورۃ الصّف کی آیت
مبارکہ 4 کے مطابق ''بنیان المرصوص'' بن گئے۔ اور ہمارے ایک ہات
میں تلوار تھی اور دوسرے میں قرآن پاک اور ہمارے آقا صلی اللہ علیہ وسلم کے آنکھو
سے اوجھل ہونے کے چند سال بعد سرزمین عرب سے نکل کر اس وقت
دنیا میں سورۃ بنی اسرائیل آیت مبارکہ 81 کے مطابق حق کے پرچم بلند
دیئے اور باطل ''زھوقا'' ہو گیا۔ تو یہ تھا وہ فلسفہ حیات اور زندگی جو ہمار
دانشوروں کو تلاش کرنا چاہیے تھی۔ اور اس میں فکری یک جہتی پیدا کر
ایسی تنظیم کی مدد سے اس ملک کو چلانا تھا۔ نہ کہ غیروں کے باطل فلسفوں

اسلامی لیبل لگا کر ان کو اسلامی بنا کر قوم کو مزید گمراہ کرنا تھا۔ کہ حق و باطل کو الگ الگ خانوں میں نہ بانٹا اور اسلام کو بھی پاش پاش کر رہے ہیں۔

مجھے اور میرے رفقاء کو اللہ تعالیٰ سبحانہٗ نے اس سلسلہ میں جو توفیق دی اور جو کچھ ہم کر سکے وہ آگے کئی زاویوں سے کئی مقامات پر واضح ہو جائے گا۔ لیکن حکومتی ادارے اور تنخواہ دار دانشور زیادہ وقت اس بات پر ضائع کرتے رہے، کہ لیاقت علی کی 1949ء کی قرارداد مقاصد میں لوگوں کو جو اللہ تعالیٰ کی ''آمریت'' میں شریک کر دیا گیا تھا، اس کافرانہ عمل پر اسلام کا کون سا لبادہ اوڑھیں۔ تو ظفر انصاری وغیرہ نے ضیاء الحق کو یہ باور کرایا کہ بے شک سیاسی گروہ بندی کی تو اسلام اجازت نہیں دیتا، لیکن اگر غیر جماعتی انتخابات کرا لیے جائیں تو یہ غیر اسلامی کاروائی نہ ہوگی۔ لیکن یہ نہ سوچا کہ انتخابات کے بعد کیا کریں گے، اور جماعتیں پھر وجود میں آ گئیں۔ یعنی'' وہی کھوتی اور وہی خرمیدان''۔ تو اسمبلیوں کی بجائے نام ''مجلس شوریٰ'' رکھ کر اپنے دل کو تسلی دے دی گئی۔ صورت حال میں کوئی تبدیلی نہ ہوئی۔ مظہر ندوی وغیرہ نے ضیاء الحق کو باور کرایا کہ اسلام میں یہ مغربی جمہوریت تو نہیں اس کو شورائی نظام کہہ لیں۔ لیکن یہ واضح نہ کیا کہ مشورہ کس عمل کے لیے لیں گے کہ سورہ آل عمران اور سورۃ الشوریٰ کے مطابق اسلام میں مشورہ امر کو چلانے کے طریقوں میں ہوتا ہے نہ کہ صورت حال کے بارے کہ اہل مغرب کی طرح مرد کو مرد کے ساتھ شادی کرنے کی اجازت دی جاتی ہے۔ اب ''امر'' کیا ہے یہی رونا، یہ عاجز 1948ء سے رو رہا ہے کہ اس کی نشاندہی کی جائے کہ زندگی کیسے گزاری جائے؟ کہ اسلامی فلسفہ حیات کیا ہے؟ اور اس سلسلہ میں اس عاجز نے جو Preamible یا 68-

نچوڑ تیار کیا ہے اس کو کوئی اخبار شائع نہیں کرنا چاہتی۔ اور سرکاری ادارے
گورنمنٹ کے تنخواہ دار دانشور اس طرف آتے نہیں کہ ان کے اس سلسلہ
کے ''مطالعے'' نہ ہونے کے برابر ہیں۔

69۔ قارئین کہانی بہت لمبی ہے۔ میں پہلے حکومتی ادارے ''اسلامی نظریا
کونسل'' کا ذکر کروں گا۔ اول تو ہماری کم علمی کی وجہ سے مجھے کبھی وہاں کو
''سکالر'' نظر نہ آیا۔ یا ''پکی روٹی'' پڑھے عالم ہوتے تھے۔ یا ماڈر
مسلمان جیسے ضیا جالندھری وغیرہ۔ ایک تنزیل الرحمٰن کچھ سمجھ بوجھ رکھ
کے دعوے پر وہاں پہنچ گیا۔ میں نے اس کے ساتھ لمبی ملاقات کی اور اس
باور کرانے کی کوشش کی کہ ہمیں خلفاء راشدین کے زمانے کا اسلام تلاش
کے قوم کو رابطوں میں باندھ کر منظّم کرنا ہوگا۔ بنیادی چیز تنظیم ہے کہ معاش
کو مساجد کے ذریعہ سے امیروں کے تحت محلّہ، گاؤں، شہر، علاقہ، تحصیل ا
ضلعوں کی سطح پر اس طرح منظّم کر کے اللہ تعالیٰ کی فوج بنانا ہوگا۔ جس طر
دنیاوی فوجیں، پلٹنوں، بریگیڈوں اور ڈویژنوں کی سطح پر منظّم ہیں۔ فق
قانون، مدون صورت میں ہمارے پاس موجود ہے۔ اس کے ذریعہ
قوم کو انصاف مہیا کیا جاتا ہے۔ اور منظّم قوم میں ہر آدمی اللہ تعالیٰ کے حقو
پورے کرتا ہے۔ تو حکومت کو صرف امر بالمعروف اور نہی عن المنکر
نشاندہی کرنا پڑتی ہے۔ تم لوگ یہ بنیادی کام کرو۔ اور تمام حکومتی ادارو
اسلامی بنانے کے لیے کچھ طریق کار وضع کرنے ہوں گے اور تمام تعلیم
معاشی، تجارتی وغیرہ معاملات کو اسلامی فلسفہ حیات کے اصولوں کے تا
کرنا ہوگا۔ تنزیل الرحمٰن یہ سب کچھ سن کر حیران ہوا۔ اور مجھ سے ''جا
چھڑانے'' کے لیے کچھ بہانے تلاش کرنے لگ گیا اور مجھ سے کہا ک

سیاسی نظاموں اور قانون کو اسلامی بنانے کا کام کر رہے ہیں۔ خاص کر وہ خود قانون شہادت Evidance Act پر کام کر رہا ہے۔ اور وہ لوگ اس طرح بتدریج اور آہستہ آہستہ اسلام لائیں گے۔ میں بڑا مایوس ہوا اور اس کو صاف کہا کہ کافرانہ رومن قانون کو اسلامی بنانا اس طرح ہے جس طرح سؤر پر تکبیر پڑھ کر اس کا گلا کاٹا جائے اور کہا جائے کہ یہ حلال ہو گیا ہے۔ اس تنزیل الرحمٰن نے اس قانون شہادت کو ''اسلامی'' بنا کر اس کی تین جلدیں شائع کیں۔ لیکن عملی طور پر وہی جھوٹ چل رہا ہے۔ اور جھوٹی گواہیوں کا قلع قمع بھی نہیں ہوسکا۔

70۔ یہی تنزیل الرحمٰن بعد میں وفاقی شرعی عدالت کا چیف جسٹس بن گیا تھا۔ تو یہ عاجز کچھ رفقاء کے ساتھ اس کی عدالت میں پیش ہوا کہ سیاسی پارٹیوں کو غیر اسلامی اور غیر قانونی قرار دیا جائے کہ اسلام میں کسی گروہ بندی کی اجازت نہیں۔ سب دینی سیاسی جماعتوں کے سربراہوں کو نوٹس جاری کرائے گئے تھے کہ وہ عدالت میں حاضر ہو کر اپنے ''وجود'' کو صحیح ثابت کریں۔ کوئی ایک بھی حاضر نہ ہوا۔ کہ کافرانہ رومن قانون کے تحت تو ملزم بھی حکومت کا ''داماد'' ہوتا ہے۔ دینی جماعتوں کے پاس ''غیر حاضری'' کے سو بہانے تھے۔ میں نے تنزیل الرحمٰن کو صورت حال باور کرانے کی کوشش کی کہ یہ حق و باطل ساتھ ساتھ نہیں چل سکتے بلکہ اس کافرانہ رومن آئین اور قانون کے تحت شرعی عدالت بنا کر اسلام اور شریعت کا مذاق اڑایا گیا ہے۔ کہ یہ عدالت ایک ''بے بس'' ادارہ ہے۔ تنزیل الرحمٰن کے پاس ہمارے ساتھ اتفاق کرنے کے بغیر چارہ نہ تھا۔ اور وعدہ کیا کہ اگلی پیشی پر تسلی کریں گے کہ سب لوگ حاضر ہوتے ہیں۔ اور حکومت کے لیے کوئی ملا جلا فیصلہ دیں گے

کہ اسلام کے نفاذ کا راستہ کھلے۔ تو میں نے ان کو یاد دلایا کہ میں ان کو مل چکا ہوں جب وہ نظریاتی کونسل کے سربراہ تھے اور ان کی توجہ ان بنیادی پہلوؤں کی طرف بھی دلائی۔ تنزیل الرحمٰن بے چارے نے کچھ وعدے تو کئے لیکن چند ماہ بعد وہ ریٹائر ہو گئے۔ اور آج تک اسلام کے نفاذ کے لیے فکری سطح پر نہ ہمارے دانشور نہ ہمارے علماء اور نہ کوئی حکومتی ادارہ کوئی کام کر سکا ہے۔ اس عاجز نے جو اپنے 19 فروری 1996ء کے بنیادی خط میں اخباروں کا ذکر کیا ہے کہ انہوں نے ہمارا رخ خانہ کعبہ کی طرف نہ ہونے دیا۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ نہ اخباروں سے کوئی رہنمائی ملی، نہ انہوں نے صورت حال پر بحث کر کے واضح کیا کہ معاملات کہاں اٹکے ہوئے ہیں۔ کہ کون کون ہے؟ یا ہم ذلت کی زندگی گزار رہے ہیں، کہ ذلت کی زندگی، آزمائش یا عذاب تینوں ایک جیسی صورتیں ہیں۔ لیکن اب اس زلزلہ کے بعد جو صورت حال ہو گئی ہے نہ ہماری قوم اس صورت حال کو سمجھ سکی ہے نہ ہمارے پاس ایسا نظام ہے کہ ہم ان حالات سے نبٹ سکیں۔ اور آگے کیا ہوتا ہے مجھے بڑی بھیانک صورت حال نظر آ رہی ہے کہ قوم نے توبہ و ندامت کی طرف بھی توجہ نہیں کی اور یہ عاجز پچاس سالوں سے جس اللہ تعالیٰ کی نافرمانی اور ذلیل زندگی کا ذکر کر رہا ہے اس کو سمجھنے کی کوئی کوشش نہیں کی جا رہی۔

71۔ اس عاجز نے زیادہ ذمہ داری اخبار نوائے وقت پر کیوں ڈالی، اب قارئین اس سلسلہ میں میری وضاحت کو بہتر طور پر سمجھ سکیں گے کئی لحاظ سے اس خامی کی ذمہ داری عام اہل قلم پر نہیں ڈالی جا سکتی، کہ سو۔ دو سو روپے کے عوض وہ یہی مکھی پر مکھی مارنے والا مضمون لکھیں گے۔ کون تحقیقوں کے

جھنجٹ میں پڑے۔ پھر اخباروں کا تنخواہ دار غریب طبقہ ہے۔ گزارا کر رہے ہیں۔ لیکن نوائے وقت والے اور جنگ والے ارب پتیوں کو بھی پیچھے چھوڑ گئے ہیں۔ ان پر تو اس دولت کے عوض قوم کی رہنمائی فرض ہے۔ لیکن جنگ سمیت اکثر اخبار اس کو ''دوکانداری'' کہتے ہیں کہ وہ حلال اور حرام دونوں بیچتے ہیں۔ لیکن نوائے وقت کا دعویٰ ہے کہ وہ قوم کے ''رہنما'' ہیں۔ حمید نظامی کی برسیاں منائی جاتی ہیں۔ اور اس کی قومی خدمتوں پر صفحات کے صفحات ''سیاہ'' کیے جاتے ہیں۔ میں پوچھتا ہوں کونسی رہنمائی اور کیسی رہنمائی، بے چارے کی مغفرت کی دعا مانگا کریں۔ مجید نظامی اور مجھ میں البتہ اب بھی کچھ قدریں مشترک ہیں۔ مجید نظامی میری طرح بھارتی ذہنیت کو سمجھتا ہے اور اس کو معلوم ہے کہ ہندو کبھی دل سے پاکستان یا مسلمانوں کا دوست نہیں ہوسکتا۔ اور کشمیر کے بارے بھی وہ میرا ہم خیال ہے کہ اس کے بغیر پاکستان نامکمل ہے۔ لیکن مصیبت یہ ہے کہ مجید نظامی، مغربی جمہوریت اور سول سپرمیسی کا اتنا قائل ہے کہ فوج جو بار بار اقتدار میں آرہی ہے، ہر فوجی کے لیے مجید نظامی کے دل میں ''نفرت'' پیدا ہو چکی ہے۔ گو وہ اس کا کھلم کھلا اعلان نہیں کرتا۔ پھر ''خاندانی'' روایات کے مطابق بھی مجید نظامی کو عسکریت یا فن سپہ گری کے ساتھ نفرت ہے۔ میرے جو اتنے مضامین اس نے شائع کیے، مجھے معلوم تھا کہ مجید نظامی کو علم تھا کہ میں کچھ فوجیوں کا ''کچا چٹھا'' کھولوں گا۔ اور یہ مجید نظامی کے لیے ''تسلی'' کے باعث ہوگا۔ علاوہ ازیں میں چونکہ اس کو کھری کھری سناتا رہتا ہوں تو وہ دل سے مجھے بھی پسند نہیں کرتا۔ اس کو خیال تھا کہ جواباً کچھ لوگ میری بھی ''ایسی تیسی'' کریں گے۔ وہ اس کے لیے خوشی کا باعث ہوگا۔ اور دو

آدمیوں نے غلط طور پر میری سوچ کی تردید کی تو وہ مجید نظامی نے شائع کیا۔ لیکن میں نے جو کچھ اپنے دفاع میں لکھا مجید نظامی نے اس کو ردی کی ٹوکری میں پھینک دیا۔

72۔ لیکن یہ عاجز سب کام ''حب للہ بغض للہ'' کے اصولوں کے تحت کرتا ہے۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ کی راہ پر نہ چلنے والوں کا میں کچا چٹھا کھول رہا تھا۔ تو جو کچھ مجید نظامی نے اس سلسلہ میں شائع کیا میں نے اس کا بہت شکریہ ادا کیا۔ اور آج بھی اس کا احسان مند ہوں اور اس کو اپنا ''محسن'' گردانتا ہوں۔ اللہ تعالیٰ سبحانہٗ اور رسول پاک صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے لیے میں سب اختلاف بھول جاتا ہوں اور جو میرے ساتھ اس اصول پر رابطہ باندھے، اس کی غلامی کرنے کو تیار ہوں۔ اور سینکڑوں خطوط میں اس عاجز نے مجید نظامی کو گزارش کی کہ آئیں وہ اور میں Holy Alliance (فطری اتحاد) میں ایک ہو جائیں۔ لیکن مجید نظامی پر کوئی اثر نہیں ہوتا کہ مغربی جمہوریت اس کا ایمان ہے۔ اور اس باطل فلسفہ کو وہ اللہ تعالیٰ کا شریک بنانے سے بھی گریز نہیں کرتا۔ جیسے شہادت صرف اللہ تعالیٰ کے راستے میں ہوتی ہے لیکن مجید نظامی اپنے بھائی کو ''شہید جمہوریت'' گردانتا ہے کہ باطل نظام جمہوریت کو اللہ تعالیٰ کا شریک بنا دیا۔ اس کو بتایا گیا کہ سورۃ الانعام آیت مبارکہ 162 کے مطابق مسلمان کا مرنا جینا اللہ تعالیٰ سبحانہٗ کے لیے ہوتا ہے۔ اس کو بتایا گیا کہ جنگ احد میں بہادری سے لڑنے والے قزمان کو جہنمی قرار دیا کہ وہ کہتا تھا کہ اپنے قبیلہ کے لیے لڑا اور پھر خودکشی کر گیا۔ مجید نظامی کو کہا گیا کہ کیوں اپنے بھائی کی موت کو حرام کی موت بناتے ہو۔ کہ اتنا کم دل تھا کہ ایوب خان کے ساتھ ''ٹکراؤ'' کو برداشت نہ کیا۔

مجید نظامی اب یہ ''تلمیح'' استعمال نہیں کرتا۔ لیکن اپنی غلطی نہ تسلیم کی اور نہ توبہ وندامت کی۔ اس کے ''چمچے'' اب بھی یہ تلمیح استعمال کرتے ہیں۔ اور یہ گناہ مجید نظامی کے سر ہے۔

73۔ پھر ایک اور کافرانہ فلسفہ گھڑ لیا گیا کہ صحافت ''پیغمبرانہ پیشہ'' ہے۔ اور سب صحافیوں کو ''پیغمبر'' بنا دیا۔ پیغمبر کا جانشین بھی اس کو کہہ سکتے ہیں جو کلمہ حق لکھے۔ نوائے وقت میں کئی دفعہ مردود گاندھی کو مہاتما لکھا جاتا ہے یعنی بہت بڑا روح۔ میں نے مجید نظامی کو ان غلط بیانیوں پر اتنے خطوط لکھے کہ ایک پوری کتاب بنتی ہے۔ میں نے مجید نظامی پر ثابت کیا کہ وہ ''اسلامی فلسفہ حیات'' سے نابلد ہے۔ اور وہ مومن کی فراست سے عاری ہے۔ خدارا قوم کے رہنما بننے کے دعووں سے باز آؤ۔ لیکن اگر ایسا کرنا چاہتے ہو تو پہلے اسلامی فلسفہ حیات کا نچوڑ شائع کرو۔ اور آئندہ جو غلطی کرو، جب تمہیں اس سے آگاہ کیا جائے تو اپنی غلطی تسلیم کرو اور اخبار میں توبہ وندامت کرو۔ لیکن یہ اصول تو مجید نظامی کی کتاب میں لکھا ہوا نہیں۔ نہ وہ کبھی اپنی غلطی تسلیم کرے گا۔ نہ توبہ وندامت کرے گا۔ ہاں ایسی غلطی شاید دہرانے سے گریز کرے۔ لیکن اس کے ''چمچے'' ایسی غلط تلمیحات کو دہراتے رہتے ہیں۔ اور گمراہی والا عمل جاری رہتا ہے۔ بہرحال حق و باطل کو گڈمڈ کرنے میں مجید نظامی اور نوائے وقت پر بہت ذمہ داری آتی ہے اور یہ عاجز پیچھے گزارش کر چکا ہے کہ مجید نظامی پر یہ ثابت کر دیا جائے کہ یہ کلمہ حق ہے۔ اور اس کی بڑی ضرورت ہے کہ اس کو شائع کیا جائے کہ فلاں باطل کلمات جو نوائے وقت نے شائع کیے، ان کا اثر زائل ہو۔ تو نوائے وقت والا یہ بات نہ مانے گا اور اپنی مرضی استعمال کرے گا۔ اور اس طرح اسلام اور پاکستان

کو بہت نقصان پہنچ رہا ہے۔ اور ساری قوم مومن کی فراست سے عاری ہو رہی ہے یعنی ''بھینسوں'' یا ''بھیڑوں'' کی طرح ہوگئی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے عملی طور پر ایک واقعہ ظہور پذیر کر دیا جو یہ سب کچھ ثابت کرتا ہے۔ یہ اب میری کتاب اسلامی نظام حکومت کا حصہ بھی ہے۔ جس کے اقتباسات میں قارئین کے لیے یہاں پیش کر رہا ہوں۔

''اے رب تیری بڑی مہربانی کہ آپ نے صورت پیدا کر دی کہ اس افلاطون (مجید نظامی) نے 1995ء میں مصطفیٰ صادق کی اخبار کے سلسلہ میں دانشوروں کے ایک اجتماع کو خطاب کرنا تھا جن میں ملک کے صدر سردار فاروق لغاری بھی موجود تھے۔ یہ مجید نظامی اٹھا۔ ایک فقرہ اجتماع میں مدعو ہونے کے سلسلہ میں شکریہ کے طور پر کہا اور پھر کہا کہ وہ اس اجتماع میں خاک تقریر کرے۔ یہ تقریر بھینس کے آگے بین بجانے والی بات ہے''۔

''رب نبی محمد ﷺ! آپ کی بڑی مہربانی کہ آپ نے مجھے توفیق دی کہ میں نے اسی دن فاروق لغاری کو کاپی دیتے مجید نظامی کو خط لکھ دیا کہ اس کو یہ کلمہ حق کہنے پر لاکھ لاکھ مبارکیں کہ اس کی فراست کام کر گئی اور اجتماع میں بیٹھے تمام لوگ فاروق لغاری سمیت جنہوں نے دانشوروں کا لبادہ اوڑھ رکھا تھا۔ وہ مجید نظامی کو ''بھینسوں'' کی طرح نظر آئے۔ لیکن مجید نظامی کے پاس اگر مومن کی فراست آ جاتی تو اس کو یہ بھی معلوم ہو جاتا کہ ملک کی سب سے بڑی ''بھینس'' وہ خود ہے۔ بلکہ ملک کے اکثر دانشوروں کو بھینس بنانے میں مجید نظامی اور اس کی اخبار نے اہم

کام کیا اور میں یہی کچھ اس کو 1979ء سے باور کرا رہا ہوں''۔

74۔ مجید نظامی کے لیے اس ایک واقعہ میں بڑے اسباق تھے۔ اور وہ توبہ و ندامت کر کے اپنے دونوں جہاں سنوار سکتا تھا۔ لیکن در اصل یہ عاجز قارئین کو دعوت دے رہا ہے کہ یہ ہماری قومی صورت حال کی پچاس سالہ زندگی پر ایسا تبصرہ ہے کہ اس سلسلہ میں کئی کتابیں لکھی جا سکتی ہیں کہ ہم مردہ قوم ہیں اور ہمارے دانشوری کے لبادہ اوڑھنے والے کتنے ''کم علم'' ہیں کہ وہ قوم کو مردہ بنانے کے عمل کو جاری رکھے ہوئے ہیں۔

75۔ ایسا کیوں ہے کہ ہم نے پاکستان بنانے کے مقاصد کو سمجھنے کی کوشش نہ کی جس کا اشارہ یہ عاجز اپنے بنیادی قوم کے نام کھلے خط مورخہ 19 فروری 96ء میں کر چکا ہے۔ کہ محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے وفا کے بدلے ہمیں لوح و قلم بخشے جانے والے تھے لیکن اپنے دامان تنگ کر کے اپنی منزل کو روٹی، کپڑا اور مکان تک محدود کر دیا۔ یہ ایک بہت وسیع مضمون ہے۔ جس کو کئی تناظر سے سمجھنے کی ضرورت تھی۔ علامہ اقبالؒ نے جو کچھ حاصل کیا وہ عشق رسول ﷺ کی وجہ سے حاصل کیا۔ اور ہم نے تو مودودی وغیرہ کے ''منفی رویوں'' کا قلع قمع نہ کیا۔ مثبت کام تو بہت کم کیا۔ علامہ اقبالؒ کے اس سلسلہ میں ایک ایک شعر جیسا کہ

شوکت سنجر و سلیم تیرے ﷺ جلال کا نمود

کے الفاظ میں بیان ہے کی تحقیق کی ضرورت ہے کہ حضور پاک ﷺ کا ایک صفاتی اسم ''قاسم'' ہے اور آپ ﷺ کی کنیت ''ابو قاسم''۔ تو سب تقسیم والا معاملہ وہاں سے شروع ہوتا ہے۔ ایرانی کاہنوں اور مدبروں نے خوابوں میں دیکھا کہ ان کے ملک کو حضور پاک ﷺ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے

حوالے کر رہے ہیں۔ اور حضور پاک ﷺ نے اپنی زندگی میں ''غزوات الہند'' کی طرف بہت اشارے فرمائے۔ اور جنگ خندق کا ایک پتھر توڑتے بہت انکشافات فرمائے۔ افسوس پاکستان کے قیام کے بعد سرکاری طور پر یا قوم کے طور پر ہم نے کسی مقصد کے تحت سیرت النبی ﷺ پر کوئی تحقیق نہ کی کہ ان اسباق سے ہم اپنی زندگی کے مسائل کیسے حل کریں اور آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی پاک زندگی یا سنت مبارکہ سے اپنے لیے فلسفہ حیات کا نچوڑ کیسے تیار کریں۔ سیرت النبی ﷺ پر کتابوں کے لیے انعام بغیر کسی تجویز اور مقصد سے شروع کیا۔ کہ کسی انعام یافتہ کتاب کا کوئی دوسرا ایڈیشن تک نہ شائع ہوا کہ ان کتابوں میں کوئی تحقیق یا نشان راہ مدنظر نہ ہوتا تھا۔ پس یہ ''نقول'' ہوتی تھیں کہ کسی پہلو کی Summary بنا دی گئی۔ صرف نقوش کے محمد طفیل نے کچھ اچھا کام کیا کہ حضور پاک صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی سیرت پاک یا احادیث مبارکہ پر جتنا مواد ملا، اس کو اکٹھا کر دیا گیا ہے۔ گو ترتیب کے لیے کوئی فارمولہ نہ بنایا اور نہ حوالے دیئے کہ کیا کچھ کہاں تلاش کیا جائے۔ اس لئے اس عاجز کو جو اس سلسلہ میں جو کچھ کام کرنے کی سعادت حاصل ہوئی اور اس عاجز اور میرے رفقاء نے اس سلسلہ میں جو کچھ کیا، وہ کہانی میں بہت اختصار سے قوم کے سامنے بیان کرنا چاہتا ہوں کہ اس سلسلہ میں اور بہت تحقیق کرنے اور نشان راہ تلاش کرنے کی ضرورت ہے۔ تو ہمارا کام شاید اس سلسلہ میں بارش کا پہلا قطرہ ہو۔

76۔ جنرل احسان الحق ڈار مرحوم ومغفور عمر میں تو مجھ سے چھوٹے تھے اور فوج میں بھی تب آئے کہ میں بارہ تیرہ سال نوکری کر چکا تھا۔ لیکن عہدہ میں ہم ''ہم عصر'' تھے۔ وہ علم کے بڑے پیاسے تھے اور فوج میں آتے ہی ان کا

عسکری تاریخ کے ساتھ لگاؤ بڑھ گیا۔ لیکن کسی رہنما کی تلاش میں تھے جو مل نہ رہا تھا۔ اس عاجز نے چونکہ ساری دوسری عظیم جنگ مبصر کی حیثیت سے دیکھی اور جنگ میں شمولیت بھی کی تھی اور عسکری تاریخ کی بھی کافی شد بد تھی۔ تو وہ مجھ سے ''متاثر'' ہو گئے اور خاص کر فن سپہ گری کی طرف میرے عملی رویہ کے وہ ''مداح'' بن گئے اس کے بعد ستمبر 65 کی جنگ آئی، جس کے بعد ڈار صاحب میجر کے طور پر Inteligence سے وابستہ ہو گئے۔ جہاں ان کی حیرانگی کی کوئی حد نہ رہی کہ بھارتی میڈیا یا تحقیقی ادارے حیران تھے کہ لاہور کے واہگہ محاذ پر پاکستان کی ایک پلٹن کی صرف دو کمپنیوں نے ان بہت سے بریگیڈوں کے حملوں کو تتر بتر کر دیا اور 21 اپریل 1969ء کو تو بھارتی لوک سبھا میں سناٹا چھا گیا، جب ان کو اس محاذ پر ان کے دس ہزار آدمیوں کے مرنے یا زخمی ہونے کا انکشاف ہوا۔ لیکن بھارتی زیادہ حیران اس وجہ سے تھے کہ ان دو کمپنیوں کا کمانڈر کرنل گول والہ بھی زخمی ہو کر فائر بندی سے چند گھنٹے پہلے ان کا قیدی بن گیا۔ مددگار کمپنی کمانڈر کیپٹن صغیر حسین بھی 22/23 ستمبر کی گھمسان کی جنگ میں شہید ہو گیا۔ اور فائر بندی کے بعد انہوں نے اپنے میجر آشا رام کے بدلے کیپٹن صغیر کے جسد کو پاکستان کے حوالے کیا۔ لیکن سب سے آگے والے کمپنی کمانڈر میجر امیر افضل جس کا نام وہ جنگی قیدیوں کی وجہ سے جانتے تھے وہ کہاں گیا؟ کہ نہ اس کا نام شہیدوں میں آیا اور نہ اسے کوئی بہادری کا تمغہ ملا۔

77۔ دسمبر 1966ء میں جب یہ عاجز تبدیل ہو کر ISPR میں پہنچا تو ڈار صاحب نے میرے ساتھ ملاقات کر کے مجھے بھارتی تذبذب سے آگاہ

کیا، تو میں ہنس پڑا اور ان کو بتایا کہ میں اس چیز سے آگاہ ہوں۔ میرے بالمقابل آخری بھارتی بریگیڈ کمانڈر نرنجن سنگھ کے ساتھ میری 23 ستمبر کی صبح کو ملاقات ہوئی تھی۔ جب ہم نے اپنے شہیدوں کی کچھ لاشیں ان سے وصول کیں اور ان کی لاشیں ان کو دیں۔ میں نے اپنی Identy پردہ میں رکھی ہوئی تھی اور بریگیڈیئر نرنجن سنگھ نے جب مجھ سے ''میجر امیر افضل'' کے بارے میں سوال کیا تو میں نے اپنے ساتھ کھڑے صوبیدار میجر اشرف سے سوال کر دیا کہ کیا تمہارا کوئی میجر امیر افضل تھا؟ جس نے ''نہ'' میں جواب دیا۔ اور میں خود اپنے آپ کو Grave Yard کے افسر کے طور پر متعارف کراتا تھا۔ تو ڈار صاحب کی دلچسپی ساری جنگ میں بہت بڑھ گئی۔ اور ایک دن دو درجن بھر جنگ میں دلچسپی رکھنے والے افسروں کو اکٹھا کر کے ڈار صاحب نے نقشوں پر اپنے دفتر میں چھٹی کے بعد لگاتار تقریباً آٹھ گھنٹے واہگہ محاذ پر ہماری لڑائی کی کہانی سنی جس کا اختصار بعد میں عنایت اللہ نے ایک کتاب ''لاہور کی دہلیز'' میں شائع کیا اور فوج کے اخبار ہلال میں بھی شائع ہوا۔ اور سب لوگ حیران تھے کہ اس زمانے میں بھی ان دو کمپنیوں نے اس کو سچ ثابت کر دیا جو سورۃ الانفال کی آیت مبارکہ 65 میں ذکر تھا کہ مومن یا مجاہدین دس گنا دشمن پر غالب آتے ہیں۔ ڈار صاحب اور باقی افسران کے سوالوں کے اکثر جوابات میں اس عاجز نے اپنے ہر عمل کو قرآن پاک اور سنت نبوی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم میں بیان شدہ تدبیرات کی پیروی کا نتیجہ ثابت کیا۔ اور سب شرکاء نے اتفاق کیا کہ فوجی تزویرات یا حکمت عملیوں یا تدبیرات کے سلسلہ میں سب کچھ ہمارے پاس قرآن پاک اور سنت نبوی ﷺ میں موجود ہے۔ اور ہم نے کسی سے کچھ نہیں

سیکھنا۔ اس سب کے احسان الحق ڈار پر عظیم اثرات ہوئے کہ ایک ماڈرن اور لبرل قسم کا پیشہ ور سپاہی اسلام کا عظیم فرزند اور مجاہد بن گیا۔ جس کے نتائج کا کچھ ذکر آگے آ رہا ہے۔ علم کے اس ''پیاسے'' انسان کو جب فرصت ملتی تھی تو وہ میرے پاس آ جاتا تھا۔ اور اسلامی علوم خاص کر اسلامی فلسفہ حیات کے تقاضوں اور نظریہ جہاد کی باتوں کو سمجھنے میں لگا رہتا تھا۔

78۔ مجھے اللہ تعالیٰ نے توفیق دی کہ 1967ء سے ہی میں نے عسکری ہفتہ وار اخبار ہلال کا رخ مکمل طور پر نظریہ جہاد اور اسلامی فلسفہ حیات کی طرف موڑ دیا۔ اور 1969ء کے ربیع الاول میں ایک عظیم سیرت یا عید میلاد النبی ﷺ ہلال کا اجرا شروع کیا۔ کہ حضور پاک صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے جلال اور جمال کے چشموں سے افواج کو خاص کر اور سب قارئین کو سیراب کیا۔ کہ لوگ اس نمبر کو ہاتھوں ہاتھ لے لیتے تھے۔ اور بعض دفعہ دوسرا اور تیسرا ایڈیشن بھی شائع کرنا پڑا۔ بہرحال فوجی اخبار ہلال نے تیزی سے ترقی کی اور اس میں لکھنے والوں کا ایک انبوہ با مقصد مضامین لکھ کر ہلال کے صفحات کو حضور پاک صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی شان کے سبق آموز بیانات اور نظریہ جہاد کے پہلوؤں سے منور کر رہا تھا۔ خوش قسمتی سے اس اخبار کی ادارت کے لیے عزیزم محمد ممتاز اقبال پہنچ گیا کہ آج سے چند سال پہلے صورت حال یہ ہوگئی کہ ہلال کے مضامین کے بیانات ملک کی اخباروں کی ''سرخیاں'' بنتے جاتے تھے۔ سنتے ہیں کہ بھارت والوں کو بھی بڑی پریشانی ہوئی۔ اور جب واجپائی نواز شریف کو ملنے آیا تو اس کا ایک مطالبہ یہ تھا کہ ہلال اخبار میں ان جہادی مضامین کو ختم کیا جائے۔ یا شاید ایڈیٹر کو تبدیل کرنے کی بات کی کہ اس ''ملاقات'' کے چند ماہ بعد محمد ممتاز اقبال کو

بغیر وجہ کے ہلال کے ایڈیٹر کی اہم جگہ سے ہٹا دیا گیا۔ اور ''خنجر ہلال'' پھر ''فوجی گزٹ'' بنا دیا گیا۔ ہمارے ملک میں ایسے ''واقعات'' ہوتے رہتے ہیں کہ شیطانی طاقتوں کو کہیں سے کوئی ''سہارا'' مل جاتا ہے کہ یہاں زور دار اسلام نہ نافذ ہو جائے۔ اور آگے پیرا 80 میں ذکر آ رہا ہے کہ ضیاء الحق نے جنرل ڈار کو اسی ''ضرورت'' کے تحت ریٹائر کر دیا۔

79۔ مجاہد احسان الحق ڈار 1979ء تک میجر جنرل کے عہدے پر پہنچ گئے اور جی ایچ کیو کے تربیتی ادارے کے سربراہ بن گئے۔ یہ عاجز انہی دنوں فوج سے آخری بار ریٹائر ہوا تھا۔ جنرل ڈار مرحوم نے جی ایچ کیو میں آتے ہی مجھے زبردستی قلم پکڑوا دی، کہ ''پاکستان آرمی جرنل'' میں حضور پاک صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی فوجی حکمت عملی، تدبیرات اور جنگوں پر مضمون اس طرح لکھوں کہ ہمارے لیے ان میں کیا اسباق ہیں۔ اور ساتھ ہی فوج کے مذہبی ادارے کے لیے ہدایات لکھائی جاتی تھیں کہ افواج میں اسلامی فلسفہ حیات اور نظریہ جہاد کی تعلیم کس طرح مرحلہ درمرحلہ جاری کی جائے اور ساتھ ہی میرے ساتھ ایک معائدہ کیا گیا کہ میں رحمۃ للعالمین ﷺ کی جنگوں اور فوجی حکمت عملی پر ایک پوری کتاب لکھوں۔ اس کے ساتھ ہی مشہور جرمن جنگی ماہر کلاسوئز کی آٹھ کتابوں کا ترجمہ تبصرے کے ساتھ کرنے کا معائدہ ہوا کہ ہم نے فلسفہ جنگ کے سلسلہ میں غیروں سے کچھ نہیں سیکھنا، سب فلسفوں سے بہتر فلسفے ہمارے قرآن پاک اور حضور پاک ﷺ کی سنت میں موجود ہیں۔ حضور پاک صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے سلسلہ میں کتاب کا نام ''جلالِ مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم'' رکھا گیا، جس کو بے مثال پذیرائی حاصل ہوئی۔ اور جلد اس کا دوسرا اور سول ایڈیشن شائع کرنا پڑا۔ پیر کرم شاہ

الازہری سابق جج سپریم کورٹ اور اب مرحوم و مغفور، یہ کتاب پڑھ کر حیران ہو گئے۔ اور ان کا کتاب پر پورا تبصرہ اب بھی میرے پاس موجود ہے۔ کہ ان کے مطابق وہ ایک انوکھی اور اچھوتی تحریر ہے۔ جس نے اس سلسلہ میں ان کے کئی پہلے علوم کو درہم برہم کر دیا اور ان کے مطابق قوم کے لیے اس میں نشان راہ ہے۔

80۔ پیر صاحب نے بڑی ندامت کی کہ اوروں کی تحریریں پڑھ کر وہ بھی جنگ احد کو مسلمانوں کی شکست سمجھتے رہے۔ اور میری کتاب پڑھنے کے بعد ان پر یہ عقدہ کھلا کہ ہمارے آقا ﷺ دنیا کے عظیم ترین سپہ سالار ہیں اور اُن کی عسکری صفات اور روحانی قوتوں کے سامنے سب کچھ ہیچ ہے۔ قارئین! پیر صاحب کے تبصرہ سے ثابت ہوتا ہے کہ سنتِ نبوی ﷺ کی کتنی تحقیق کی ضرورت ہے۔ بہر حال، جنرل احسان الحق ڈار کے پاس اس سلسلہ میں جو تبصرے پہنچے اور ان کو جو خراج تحسین پیش ہوا کہ حضور پاک ﷺ کی سیرت اور اُن کے رفقاء کے عملی اسلام پر بہت تحقیق کی ضرورت ہے، تو انہوں نے مجھے خلفاء راشدین کی حکمت عملیوں پر کتابیں لکھنے کی ذمہ داری بھی سونپ دی اور فیصلہ ہوا کہ ساری اسلامی عسکری تاریخ اسی طرح با مقصد طور پر لکھ کر اس میں سے اپنے لیے ''نشان راہ'' تلاش کیا جائے گا۔ اب ضیاء الحق کے بارے پیراگراف نمبر 7 میں ذکر ہو چکا ہے کہ اس کا اسلام ''مصلحتی'' تھا اور وہ بہت بڑا ''بہروپیا'' تھا کہ پہلے میرا چھوٹا بھائی بنا ہوا تھا، لیکن مارشل لا لگانے کے بعد مجھ سے ''دور'' ہو گیا۔ کہ میرے اسلام کے ''جلالی'' پہلو سے وہ آگاہ تھا۔ بلکہ برادرم بریگیڈیئر صدیق ستی اب مرحوم و مغفور کی وساطت سے ہم یہ بھی جانتے تھے کہ میڈیکل لحاظ سے ضیاء الحق فوج میں آنے کے

لیےFit نہ تھا۔ اور اپنے والد کے قادیانی دوستوں کی مدد سے وہ فوج میں آیا تھا۔ اس لیے اندرونی طور پر قادیانی اور چھپے قادیانی ضیاء الحق کے ''مشیر'' تھے۔ اب ان میں سے کسی نے ضیاء الحق کو ''خبردار'' کیا یا ضیاء الحق، احسان الحق اور میرے ''رابطے'' سے خوف کھانے لگا کہ جلالی اسلام والے طاقت پکڑ جائیں گے اور اس کو کرسی سے اتار دیں گے۔ ضیاء الحق نے بغیر وجہ کے وقت سے پہلے احسان الحق ڈار کا ترقی کا نمبر کاٹ کر اس کو فوج سے ریٹائر کر دیا۔ اور آگے کیا لکھیں۔ خلفاء راشدینؓ کی کتابوں کی اشاعت میں بھی روڑے اٹکانے شروع کر دیئے گئے۔ اور ان کی اشاعت میں فضول طور پر تین سال لگا دیئے۔ لیکن اسی دوران ضیاء الحق نے بری فوج کی سربراہی چھپے لاہوری قادیانی جنرل کے ایم عارف کے سپرد کر دی، جس نے ان کتابوں کو یونٹوں کی لائبریریوں میں ''بند'' کرا دیا اور کوئی فائدہ نہ اٹھایا۔ اب بھی جب کسی صاحب ایمان سپاہی کی ان کتابوں پر نظر پڑ جاتی ہے اور وہ یہ کتابیں پڑھ لیتا ہے تو مجھے خراج تحسین کا خط موصول ہو جاتا ہے۔ بہرحال یہ تصویر کا دوسرا یا سیاہ رخ تھا۔ پیرا 7 میں ذکر ہو چکا ہے کہ مارچ 1988ء میں مدینہ منورہ میں مجھے اس کے عبرتناک انجام کے بارے اشارہ ہو گیا تھا اور اگست 1988ء میں اس کے پرخچے اڑ گئے۔

حذر اے چیرہ دستاں سخت ہیں فطرت کی تقدیریں

81۔ بہرحال جنرل ڈار کے ساتھ یہ ''ان ہونی'' ہونے کے باوجود اس عاجز کے دل میں ایک ''تحریک'' اٹھی کہ سورۃ ص کی آیت مبارکہ 75 کے مطابق جو رب کی ذات پاک نے انسان کی تخلیق کے سلسلہ میں جو دو ہاتھوں کا ذکر کیا ہے۔ جناب ابن عربیؒ کے مطابق ایک ہاتھ میں جلال تھا اور دوسرے میں

جمال، اس لیے مجھے اپنے آقا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی شان میں میری کتاب ''جلال مصطفیٰ ﷺ''، ایک ''ادھوری'' کتاب نظر آئی، تو اس عاجز نے جلال کے پہلو کو بھی وسعت دیتے رحمۃ للعالمین ﷺ کے جلال اور جمال دونوں پہلوؤں پر ایک کتاب کا مسودہ تیار کیا، جس کا نام ''حضور پاک ﷺ کا جلال اور جمال'' رکھا۔ اور 1983ء میں جنرل احسان الحق ڈار کی وفات سے چند ماہ پہلے اس کتاب کے لیے جنرل ڈار سے اس کا تعارف بھی لکھوالیا۔ جنہوں نے اپنی موت کی پیش بینی کرتے پاکستان کے قائدین اور افواج پاکستان کے کمانڈروں کو پیغام دیا کہ اس کتاب میں وہ سب کچھ پائیں گے جن سے راہ راست اور صحیح طریق کار اختیار کرنے میں مدد ملے گی۔ ان کے لمبے چوڑے تعارف سے ہم یہاں پر دو فقرے نمونے کے لیے پیش کرر ہے ہیں۔

''کہ کتاب کی علمی اور عقلی افادیت سے قطع نظر انداز بیان اس قدر پیارا ہے کہ خود بخود دل میں تحریک پیدا ہوتی ہے، اور آنکھوں میں طوفان اٹھتا ہے کہ قلب ونظر کی یہ کیفیت بیان کرنا مشکل ہے۔ اسلامی فلسفۂ حیات کے بارے بیان عملی نقطہ نظر سے کسی داستان پارینہ کے سایہ کے طور پر نہیں، بلکہ روزمرہ کی سائنسی اور تکنیکی تصادم کو مدنظر رکھ کر ان کے خیال کے مطابق پہلی دفعہ پیش کیا جارہا ہے۔ اور یقیناً اسلامی دفاع (یعنی نظریہ جہاد کا عملی پہلو) تو پہلی مرتبہ پیش کیا گیا ہے''۔

82۔ اس تحقیقی ضخیم کتاب کو اکثر پبلشرز شائع کرنے کو تیار تھے کہ تجارتی لحاظ سے یہ سودمند ثابت ہوگی، لیکن وہ کتاب کی قیمت تقریباً چار، پانچ سو روپے

مقرر کرنا چاہتے تھے۔ تو عام آدمی یہ کتاب خرید نہ سکتا تھا۔ تو اس عاجز کو پیسے اکٹھے کرنے پر دس سال لگ گئے کہ میں کتاب پر خرچ سے بھی کم صرف 150 روپے قیمت لگا کر کتاب بیچنا چاہتا تھا۔ تو دس سال مسودے پر بھی "نظر ثانی" ہوتی رہی۔ اور جنرل ڈار کی وفات کے بعد انہی کے تعارف سے یہ کتاب 1993ء میں شائع ہو سکی۔ جس کو جو پذیرائی ملی اور مجھے جو "مقامات" حاصل ہوئے، ان پر دھیان کرتے میرے آنسو خشک نہیں ہوتے۔ مومن کی فراست کے حامل وزارت مذہبی امور کے ان زمانوں کے ایک سیکرٹری جناب مفتی محمد لطف اللہ کی کتاب پر نظر پڑ گئی۔ وہ سیرت پر کئی انعام یافتہ کتابوں کا مطالعہ کر چکے تھے۔ لیکن ان کتابوں میں ان کے لیے وہ روحانی غذا نہ ہوتی تھی۔ جو اس کتاب نے ان کو مہیا کی۔ اور انہوں نے سینکڑوں کتابیں خرید کر کے ہمارے سفارت خانوں اور مرکزی حکومت کے دفتروں کو مہیا کر دیں۔ چند سال بعد اللہ تعالیٰ کی ذات پاک نے مجھے خلفاء راشدین کی کتابوں کے سول ایڈیشن کی اشاعت کی سعادت عطا فرمائی۔ تو وہ کتابیں پڑھ کر حیران ہوئے کہ علم کے ایسے "خزانوں" کے بارے قوم بے خبر ہے۔ کاش! وہ حکومت میں ہوتے تو ان کتابوں کی سرکولیشن بھی "حضور پاک ﷺ کے جلال و جمال" کی طرح کراتے۔ اللہ تعالیٰ سبحانہٗ اور رسول پاک صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی وساطت سے جناب لطف اللہ صاحب اور میرے درمیان یہ دائمی رشتہ بہت گہرا ہو چکا ہے جس کی تفصیل آگے پیرا 136 میں آ رہی ہے۔ کہ کرنل شیر محمد جن کا ذکر پیرا 65 میں ہو چکا ہے اور آگے پیرا 93 میں بھی ذکر آ رہا ہے، ان کی اور جنرل ڈار کی وفات نے میری زندگی میں جو خلا پیدا کیا تھا، محمد لطف اللہ

صاحب نے ''شیر محمد کے علم'' اور جنرل ڈار کے ''سہارا'' اور حوصلہ افزائی والی ''ضرورتوں'' کو اور بہتر طور پر آ کر مجھے مہیا کر دینا شروع کر دیا ہے۔

83۔ ضلع شیخوپورہ کے قصبہ مریدکے کے جناب حاجی عبدالمجید انجینئر کو ''حضور پاک ﷺ کے جلال و جمال'' کی اشاعت سے کئی سال پہلے خواب میں اس کتاب اور راقم کے بارے کوئی اشارہ ہوا۔ وہ کئی سال ''تلاش کی منزلوں'' سے گزرتے رہے کہ کتاب کی اشاعت کے فوراً بعد راولپنڈی پہنچ گئے اور جس ''عقیدت'' کا اظہار کیا اس نے مجھے حیران کر دیا۔ اس کتاب کی سینکڑوں کاپیاں اور میری دوسری کتابیں مجھ سے خرید کر مفت بانٹنا شروع کر دیں ان کے مداحوں کا ایک بڑا ''حلقہ'' تھا اور ہر سال حضرت علیؓ کی شہادت کا دن، 21 رمضان، مریدکے میں ایک بہت بڑی افطاری سے مناتے تھے۔ سوموار کے دن کے ساتھ حضور پاک ﷺ کی وجہ سے والہانہ محبت تھی۔ دو تین سال ہوئے 21 رمضان سوموار کا دن تھا، افطاری کی دعوت کا سارا بندوبست جب تیار ہو گیا۔ تو دن کے نو بجے کہنے لگے ''آج کا دن بہت مبارک ہے کہ مجھے اس دنیا کے قید خانہ سے نجات مل جائے۔ تو سورج غروب ہونے سے پہلے مجھے دفن کر دینا۔'' اور پھر ایسے ہی ہوا اب وہ اپنے پیچھے اپنی اولاد اور عاشقانِ رسول ﷺ کا انبوہ چھوڑ گئے ہیں۔ جو سب مجھے اتنا تقدس دیتے ہیں کہ مجھ پر رقت طاری ہو جاتی ہے۔

84۔ کس کا ذکر کروں اور کس کا نہ کروں۔ خودنمائی کا ڈر لگتا ہے۔ صوبہ سندھ میں کندکوٹ سے پروفیسر عبدالخالق سیرانی اور صوبہ سرحد کے ضلع بنیر شریف سے علماء کا ایک وفد ''زیارت'' کے لیے آئے کہ ایسے الفاظ سن کر مجھے شرم آنے لگتی ہے۔ بہرحال بریگیڈیئر گلزار احمد مرحوم جیسے گھرانوں کے لیے یہ

متبرک کتاب بن گئی۔ لیکن مجھے بریگیڈیئر صدیق ستی جن کا ذکر پیرا 180 میں ہو چکا ہے، نے بالکل حیران کر دیا۔ کہنے لگے انہوں نے قرآن پاک کی متعدد تفسیریں پڑھی ہیں جو صرف قرآن پاک کے الفاظ کا کچھ مفہوم اور کچھ پس منظر واضح کرتی ہیں۔ یہ کتاب قرآن پاک کی عملی تفسیر ہے۔ کاش کوئی مفسر ''متعلقہ آیات مبارکہ'' کی وضاحت اس کتاب کے بیانات کی مدد سے کر دے۔ اللہ تعالیٰ کے رنگ کہ اس ذات پاک نے یہ کام کرنے کی سعادت بھی اس عاجز کو عطا کر دی۔ جو کام کرنا میں نے کبھی سوچا بھی نہ تھا۔ کہ کہاں یہ کم علم عاجز اور کہاں قرآن پاک کی تفسیر؟ یہ ذکر آگے پیرا 134 میں آ رہا ہے۔ بہر حال اس زمانے میں اس کتاب کے سلسلہ میں کچھ صاحبِ فراست افراد کے تاثرات اور رویوں کو میں نے ریکارڈ کر لیا تھا، جس میں سے کچھ چیدہ چیدہ الفاظ کو یہاں پیش کر رہا ہوں۔

''بری فوج کے سربراہ جنرل وحید کاکڑ کو جنرل امیر حمزہ ہلال جرأت، ستارہ جرأت نے ایک خط لکھا۔ کہ ان دنوں جو فوجی بارکوں اور چھاؤنیوں میں جگہ جگہ ایمان، تقویٰ اور جہاد فی سبیل اللہ کے بورڈ لگے ہوئے ہیں۔ یہ ایک ''لیپا پوتی'' ہے۔ کہ ان باتوں کو ہماری فوج میں کوئی بھی نہیں سمجھتا کہ ان پر عمل کیسے کریں۔ ان پہلوؤں کو سمجھنے کے لیے غیروں کے تزویراتی اور تدبیراتی فلسفہ جنگ کی نقالی کی بجائے ہمیں سب کچھ اپنے رہنما حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ کی سنت سے سیکھنا ہو گا۔ اور یہ باتیں کتاب '' حضور پاک ﷺ کے جلال و جمال'' میں بڑی خوبصورتی سے بیان کی گئی ہیں۔ آپ کے سب فوجی افسروں کو

یہ کتاب پڑھنا چاہیے۔

جنرل موصوف نے ایک لمبے چوڑے خط میں مجھے یہاں تک لکھ دیا ہے کہ یہ کتاب لکھ کر میں نے امت مسلمہ پر بہت بڑا احسان کیا ہے۔

اسلام کے عظیم فرزند پاکستان کے مایہ ناز اور اس وقت شاید ملک کے سب سے زیادہ عمر رسیدہ صحافی اور درجن بھر سے زیادہ کتابوں کے مصنف سید شبیر حسین لکھتے ہیں۔

''حضور پاک ﷺ کے جلال و جمال جیسے حقیقت پسندانہ تجزیوں اور بامقصد تحقیق والی کوئی اور کتاب میری نظروں سے نہیں گزری۔ مصنف نے نہایت جرأت کے ساتھ جہاد کے اسلامی تصور سے وہ تمام پردے اتار دیئے ہیں جو مسلمان علماء اور دانشوروں نے اپنی آرام طلبی، بزدلی اور کوتاہ بینی کی بنیاد پر ڈال رکھے تھے۔ وہ کہتا ہے کہ مولوی نے جہاد اور قتال کو دو مختلف شعبوں میں ڈال دیا ہے، کہ عام مسلمان خون کے کھیل سے دور رہے۔ اور کئی دانشورں نے جہاد کو بظاہر ظالمانہ عمل قرار دیا ہے۔ اس نے انکشاف کیا ہے کہ جناب رسول پاک ﷺ کی رحلت کے بعد پہلے سو سالوں میں جو چالیس کتابیں لکھی گئیں ان کا نام ''مغازی''، یعنی علم جنگ تھا۔ فقہ، سیرت یا حدیث کے الفاظ اسلام میں مزید ایک سو سال بعد آئے۔ مصنف کا یہ احساس کہ وہ ''حضور پاک ﷺ کا سپاہی'' ہے، نے اس کو بے پناہ جرأت، حوصلہ اور دانش سے نواز دیا ہے۔ تقریباً چھ سو بڑے

صفحات کی کتاب میں اتنا زیادہ مواد اکٹھا کیا، اور اتنے عقدے کھولے کہ شاید کوئی اور صاحب یہ کچھ مشکل سے کر پائیں گے۔ ناموس رسول ﷺ پر قربان ہو جانے والے غازی ملک میاں محمد شہید کے بھائی ملک نور محمد نے مصنف کو بہت کچھ لکھا لیکن اکثر جائزوں میں علاقہ اقبالؒ کے تفکر کے استعمال نے ان کو حیران کر دیا۔ اسی چیز کو عاشق رسول ﷺ میجر سلطان اکبر اس طرح بیان کرتے ہیں کہ مصنف کو شعر و شاعری کے ساتھ زیادہ رغبت نہیں۔ لیکن معلوم ہوتا ہے کہ ضرورت کے وقت علامہ اقبالؒ کے شعر الہام کے طور پر ان کے سامنے آتے ہیں۔ جنرل عمران اللہ، جنرل امیر حمزہ، بریگیڈیئر صدیق ستی، آغا مرتضی پویا، بریگیڈیئر فضل الرحیم، کرنل رشید احمد، میر معظم علوی، بریگیڈیئر مشتاق، میجر غلام یاسین، میجر عبدالکریم، کرنل عبدالرؤف، شیر افضل نیازی اور عظیم بھٹی وغیرہ کئی صاحبان نے کتابیں مصنف سے خرید کر رشتہ داروں اور رفقاء کو تحفہ کے طور پر بھیجیں۔ بریگیڈیئر نثار احمد قریشی جیسے بزرگ پنڈی سے گزرتے وقت مبارک دینے مصنف کے گھر تشریف لائے۔ ویسے حوصلہ افزائی کرنے والے تو بہت ہیں جن میں ایل. ڈی جنجوعہ، پرویز اختر، محمد متین خالد، قاضی عبدالقدوس، بریگیڈیئر بشیر احمد، حافظ حبیب اللہ قریشی، کرنل چوہدری افتخار، انتظار مغل، مجاہد منصوری، بابو محمد اشرف، کرنل محبوب الٰہی، میجر جنرل ممتاز، غلام خیر البشر،

میجر عجائب حسین، بریگیڈیئر نور آصف، جنرل فضل مقیم، حافظ شفیق الرحمٰن، محمد سلیمان، جنرل محمد شریف، جنرل سوار خان، سینیٹر بریگیڈیئر محمد حیات، کرنل محمد ہاشم محسود، میجر شکیل احمد، میجر محمد رفیق ناز، چوہدری محمد اکرم، میجر خان افضل، کرنل مسعود احمد، کرنل فرید ملک، کرنل اسلم غنی، کرنل محمد عارف، میجر مظفر عالم، بریگیڈیئر قمر ، الحاج ریاست علی، کرنل لطف اللہ نیازی، میجر رحمت خان، کرنل رزاق مرزا، میجر اسلم، کرنل محمد ایوب، بریگیڈیئر نعیم رانا، ڈاکٹر فیصل، جسٹس علامہ فدا حسین، جنرل حمید گل، چوہدری افضل چیمہ، ملک احمد سرور، عبدالرزاق مالک محمدی دارالمطالعہ، کرنل محمد اسلم ایم سی، نجیب جنجوعہ، کرنل چوہدری شہباز، کرنل خالد، ممتاز اقبال، میجر محمود، کرنل غفار مہدی ایم سی، میجر محمد ہادی، کرنل ایوب رانا، غلام ربانی وغیرہ متعدد صاحبان شامل ہیں۔ اوران کی تعداد میں اضافہ ہورہا ہے۔

کیپٹن آصف رضا اوران کی بیگم یاسمین (متحدہ پنجاب کے وزیراعظم سکندر حیات کی پوتی) نے کتابیں رفقاء کو تحفہ کے طور پر بھی دیں اور دو درجن کتابیں خود بیچنے کا بندوبست بھی کیا''۔

85۔ اب حیرانگی کی بات یہ ہے کہ قارئین جب ان متعدد صاحبان کے نام پڑھیں گے تو ان میں صرف ایک صحافی سید شبیر حسین نظر آئے گا۔ وہ بھی اب وفات پا چکے ہیں اور تمام اخباروں اور اخبار نویسوں سے بہت نالاں تھے اوران کو منہ پر کھری کھری باتیں سناتے تھے کہ وہ لوگ قوم کو گمراہ کر

رہے ہیں۔ اخباری دنیا کا بچہ بچہ مجھے جانتا ہے لیکن یہ ''خاندان'' ہی ایسا ہے کہ اس نمک کی کان میں سب نمک ہو جاتے ہیں۔ اس عاجز نے صفحہ 35-34 اور خاص کر پیرا 73 میں جو لکھا تھا کہ مجید نظامی مومن کی فراست سے عاری ہے یہ سب صحافیوں کو لاگو ہے اور ان کا تکبر بھی دیکھنے والا ہوتا ہے۔

86۔ قارئین کو اس اوپر والی لسٹ میں کسی سیاسی دینی جماعت کے ممبر یا کسی ''مولوی'' اور ''مولانا'' کا لبادہ اوڑھنے والے کا نام بھی نظر نہ آئے گا۔ حالانکہ میں ان کو سینکڑوں تبلیغی خطوط لکھ چکا ہوں۔ اور بہت لوگ مجھے جانتے ہیں۔ یہی نہیں قارئین کو اس لسٹ میں کوئی سیاستدان بھی نظر نہ آئے گا۔ اور جن لوگوں کا میں نے ذکر کیا ہے ان میں سے اکثر مجھے پہلے سے نہ جانتے تھے۔ پیرا 82 میں جو محمد لطف اللہ مفتی صاحب کا ذکر ہے یا پیرا 83 میں جو حاجی عبدالمجید صاحب کی کہانی ہے ان کے ساتھ پہلے ذرا بھر شناسائی نہ تھی۔

87۔ قارئین زیادہ حیران نہ ہونا، پورے دو سال اخبار نوائے وقت کے سنڈے میگزین میں پاکستان کے اللہ تعالیٰ کا ایک راز ہونے کے مضامین شائع ہوتے رہے۔ جن کو اخبار نے ''چشم کشا'' مضامین کا نام دیا۔ اس سلسلہ میں میرے ساتھ ہزاروں صاحبان نے بذریعہ فون اور خطوط رابطہ باندھا۔ ان میں ایک بھی دانشوری کا لبادہ اوڑھنے والا صحافی یا ادیب یا سیاستدان نہ تھا۔ ہاں چند باعمل مسلمانوں نے ضرور رابطہ باندھا جنہوں نے داڑھی رکھی ہوئی تھی۔ ان کو مولوی کہہ لیں لیکن کسی دینی سیاسی جماعت کے مولوی نے رابطہ نہ باندھا۔ بلکہ ایسے ادیب یا صحافی یا سیاستدان جب کسی اکٹھ میں

میرے سامنے آ جائیں تو میں کوئی لگی لپٹی رکھے بغیر ان کو خوب کھری کھری سناتا ہوں۔ اس لیے یہ لوگ ایسے اجتماعوں میں مجھ سے دور ہی رہتے ہیں۔ اور میں اعلان کرتا ہوں کہ ہم جس عذاب میں گرفتار ہیں۔ اس سلسلہ میں زیادہ ذمہ داری انہی لوگوں پر آتی ہے۔ لیکن تحریر کے منفی اثرات دور کرنے کے لیے آخر میں کتاب ''حضور پاک ﷺ کے جلال و جمال'' کے سلسلہ میں ملک کے ایک عظیم دانشور اور سیالکوٹ کے ایک عظیم علمی، سادات کے گھرانے کے فرزند جنرل سید رفاقت کے مصنف کو خط کے چند اقتباسات پیش کیے جاتے ہیں۔

''الحمدللہ کہ میں نے آپ کی تصنیف ''حضور پاک ﷺ کا جلال و جمال'' اول سے آخر تک پڑھی۔ اللہ تعالیٰ کا لاکھ لاکھ شکر ہے کہ اس نے مجھے اس کتاب کو پڑھنے کی سعادت بخشی۔ یہ کتاب جس کی ایک ایک سطر عشق رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے مہک رہی ہے۔ زبان سادہ اور غیر رسمی ہے۔ جس سے صداقت اور خلوص کا ہر لمحہ احساس رہتا ہے۔ روانی، تحقیق اور عقیدت کا یہ دل کش امتزاج پڑھنے والے پر ایک گونا گوں آسودگی کا گہرا اثر پیدا کرتا ہے۔ قاری اپنے گرد ایک حلقہ تنویر محسوس کرتا ہے اور جی یہی چاہتا ہے کہ اس حلقہ تنویر کی روحانی آسودگی میں بیٹھے۔ اور اس مانوس تنفس کی صدا استنتار ہے۔

حضور پاک صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے متعلق ام معبدؓ کے الفاظ بہت ہی دل کش اور پیارے ہیں۔ آپ نے بھی دو دفعہ ان الفاظ کا حوالہ دیا ہے۔ لیکن لطف کی بات یہ ہے کہ ام معبدؓ کے

الفاظ کس طرح آپ کی اپنی تحریر میں ایک نگینہ کی طرح جڑ گئے۔ ان الفاظ کو سیاق و سباق میں کوئی اجنبیت نہیں محسوس ہوتی۔ کیونکہ ساری کی ساری کتاب کا مرکزی تھیم تو تھا ہی حضور پاک ﷺ کا جمال و جلال۔ جب میں کتاب کی سطروں اور صفحوں سے گزر رہا تھا تو سوچ رہا تھا کہ کتنی بار آپ پیر مہر علیؒ والی منزل سے گزرے ہوں گے۔ جہاں آپ کی روح نے تڑپ تڑپ کر کہا ہوگا۔ ؎

کتھے مہر علیؒ کتھے تیریؐ ثنا
گستاخ اکھیاں کتھے جا اڑیاں

اللہ اللہ یہ وہ مقام ہے جہاں فرشتوں کے پر بھی جل جاتے ہیں۔ اور اشرف علی تھانوی بھی پکار اٹھتے ہیں۔ کہ اگر احمد رضا مجھے کافر نہ کہتا تو خود کافر ہو جاتا۔ اور اسی کیفیت میں معراج کے متعلق آپ کا تاثر کہ معراج مکان و زمان سکڑ کر حضور پاک ﷺ کے تابع ہونے کا نام ہے۔ یہ ہمارا ایمان ہے کہ ضرور بر ضرور اپنے حبیب ﷺ کی بشری صورت کے ساتھ اللہ تعالیٰ نے لامحدود ہوتے ہوئے بھی اپنے آپ کو محدود کیا ہو گا۔۔۔تو آپ ﷺ نے لامحدود کو محدود صورت میں کچھ دیکھا ضرور۔ سبحان اللہ یہ کتنے پیارے بیانات ہیں۔

جہاد، یوں معلوم ہوتا ہے آپ کی تصنیف کا مرکزی عنصر ہے کیونکہ یہ اسلام کا مرکزی رکن ہے۔ مجھے خوشی ہوئی کہ آپ نے اس میں معذرت خواہانہ رویہ نہیں اپنایا۔ حضور پاک ﷺ کا سپاہی

تو خیر یہ رویہ اپنا نہیں سکتا تھا۔

جنرل رفاقت صاحب کا خط بڑا طویل تھا۔ اور ایسے خطوط اور رابطوں کا سلسلہ جاری ہے۔ کتاب کا پہلا ایڈیشن بہت جلدی فروخت ہو گیا لیکن وہ رقم میں دوسری کتابوں کی اشاعت پر خرچ کر چکا تھا۔ عطیات اور خیرات یہ عاجز نہیں لیتا۔ عاشق رسول ﷺ میجر غلام یاسین نے دوسرے ایڈیشن کے لیے ''قرضہ حسنہ'' کی پیش کش کی۔ لیکن اسی دوران کرنل شیخ عبدالرؤف جن کا ذکر پیرا18 میں ہو چکا ہے اور ملک کے مایہ ناز سائنسدان سلطان بشیر محمود جن کا تفصیلی ذکر آگے پیرا134 میں آ رہا ہے، نے ''سانجھ کھاتے'' کی پیش کش کر دی۔ کہ دوسرا ایڈیشن مل کر شائع کریں۔ اور ہر ایک اپنے حصے کی کتابیں فروخت کرنے کا بندوبست خود کرے گا۔ تو نظر ثانی کے ساتھ دوسرا ایڈیشن شائع بھی ہو گیا۔ اور چند ماہ میں سب کتابیں فروحت ہو گئیں کہ خرچ کے مدنظر کتابیں -/150 روپے یا اس سے بھی کم قیمت پر فروخت کی گئیں۔ لیکن یہ عاجز اب قرآن پاک کی تفسیر میں مصروف ہو گیا تھا جو ذکر پیرا134 میں آ رہا ہے، تو اب کسی اور کتاب کی اشاعت اور فروخت کا کام اس عمر میں میرے لیے بہت مشکل تھا، تو پیرا150 میں جن آفتاب طارق صاحب کا ذکر ہے ان کے رفقاء ملک محمد اقبال، ملک خضر حیات، مسٹر سعید اور نعمان صاحب وغیرہ کئی صاحبان کو رب سبحانہٗ نے سعادت عطا فرمائی کہ کچھ رقم اکٹھی کر کے انہوں نے ''حضور پاک ﷺ کے جلال و جمال'' کا تیسرا ایڈیشن شائع کر دیا ہے، جس کی آدھے سے زیادہ کتابیں فروخت ہو چکی ہیں اور کچھ لوگ چوتھے ایڈیشن کی تجویز بنا رہے ہیں۔

89۔ ہمیں جو سعادت نصیب ہوئی ہمیں کوئی ایسی غلط فہمی نہیں کہ ہم ''اکیلے'' ایسی سعادتیں حاصل کر رہے ہیں۔ اس سلسلہ میں بے شمار لوگ اور ادارے کئی میدانوں میں کام کر رہے ہیں۔ اکیلے کرنل انور مدنی صاحب، حضور پاک صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم، آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے آباواجداد اور اہل بیت رضوان اللہ علیہم اجمعین کی شان میں دو درجن سے زیادہ کتابیں شائع کر کے ان کو مفت تقسیم کر چکے ہیں۔ یہ سب ''دولت'' کہاں سے آ رہی ہے۔ کاش! ہم لوگ اپنے آقا ﷺ کی شان کو سمجھنے کے لیے عاجزی کریں۔ یہ ''عطا'' ہے اور عاجزی سے حاصل ہوتی ہے۔ ہمارے والدین کی اللہ تعالیٰ مغفرت فرمائے کہ انہوں نے ہمیں بچپن میں اسلام کی ''لوری'' دی۔ اور ہم نے زندگی میں زیادہ اثرات ان لوگوں سے لیے جو اللہ تعالیٰ سبحانہٗ کے انعام یافتہ تھے۔ سید شبیر حسین جن کا ذکر پیرا 85 میں ہوا۔ وہ میری کتاب ''جہادِ کشمیر'' کے تعارف میں جو لکھتے ہیں وہ یہاں پیش کیا جاتا ہے۔

''امیر افضل نے اپنی فوجی ملازمت میں جو نہ صرف پاکستان کی تخلیق سے پہلے شروع ہوئی تھی بلکہ دوسری جنگ عظیم سے بھی پہلے شروع ہوئی، سب کچھ آنکھیں کھول کر دیکھا۔ اور جو کچھ مادی آنکھوں سے دیکھا اسے اپنے زندہ اور بے چین قلب سے پرکھا۔ میں اکثر سوچتا ہوں کہ ایک ہی شے کو دیکھنے والے اور ایک ہی بات کو سننے والے کیوں الگ الگ اندازے لگاتے ہیں۔ کیوں اکثر لوگ دیکھنے کے باوجود کچھ نہیں دیکھ پاتے۔ اور کیوں ایسے اشخاص بھی ہیں جو دور کھڑے ہو کر سب کچھ دیکھ

لیتے ہیں۔ امیر افضل نے دونوں طرح سے دیکھا۔ قریب سے
بھی اور دور سے بھی۔ اور ہر حالت میں پورے طور پر نگاہ ڈالی
ہے۔ یہی شے ہے جو ان کو بے شمار دوسرے دیکھنے اور لکھنے
والے سے ممیّز کرتی ہے۔ ان کی کتاب جہاد کشمیر ۴۸۔۱۹۴۷ء
صرف تاریخ ہی نہیں، ایک زبردست جھنجھوڑ بھی ہے۔ اس کے
مطالعہ سے پتا چلتا ہے کہ قوموں کی زندگی میں سینہ سپر ہو کر خون
دینے کی صلاحیت بہت بڑی اہمیت رکھتی ہے''۔

90۔ سید شبیر حسین نے ان چند الفاظ میں ایک پوری کتاب لکھ دی ہے۔ خاص کر ہماری پوری قوم اس کوتاہی کی شکار ہے کہ اکثر لوگ دیکھنے کے باوجود کچھ نہیں دیکھ پاتے۔ آزادی کے وقت انگریز قوم نے ہمارے ساتھ کتنی بے ایمانی کی کہ مسلمانوں کی اکثریت آبادی والے علاقے وہ ہندوؤں کے حوالے کر گئے۔ آزادی کے بعد ہمارے انگریز نوکروں سے ہمارے ساتھ کیا غداریاں کرائیں کہ دو تہائی کشمیر ہم آزاد کرا چکے تھے۔ تو دھوکے سے ہمارے یہ انگریز نوکر یہ علاقے بھارت کو دے گئے۔ پیرا32 میں یہ عاجز گزارش کر چکا ہے کہ 48-1947ء میں کئی دفعہ ہم بھارتی فوج کو کشمیر میں تہس نہس کرنے کے قابل تھے۔ لیکن ہمارے انگریز نوکروں نے ہمیں ایسا نہ کرنے دیا علاوہ ازیں یہ عاجز دو کتابیں لکھ چکا ہے کہ ہمارے رہنماؤں خاص کر لیاقت علی اور ذوالفقار بھٹو نے ہمیں خوب بے وقوف بنایا۔ ہماری مثال ان کافروں کی طرح ہے جن کا ذکر سورۃ البقرہ کی آیت مبارکہ 17 اور 18 میں ہے کہ وہ اندھیرے میں پھر رہے ہیں اور اندھے، گونگے یا بہرے ہیں۔ اور میں نے یہ الفاظ استعمال کئے کہ یہ لوگ مومن

کی فراست سے عاری ہیں۔ اور بدقسمتی سے کچھ سمجھدار لوگ بھی ''مصلحت'' کے طور پر قوم کو سچ اور حق کی باتیں نہیں بتاتے۔ اس عاجز نے کوئی لگی لپٹی نہیں رکھی اور اپنے بنیادی 19 فروری 96ء کے خط میں صاف طور پر لکھا کہ لنگڑا لولا پاکستان اینگلو امریکن بلاک کی بھی ضرورت تھا۔ اس عاجز نے اپنی آنکھوں سے دیکھا کہ خود مسلمانوں نے پاکستان بننے کی کتنی مخالفت کی اور پیرا 14 میں واضح کر آیا ہوں کہ اگر ہم مسلمان متحد ہوتے تو آدھے ہندوستان پر ہمارا حق تھا۔ چنانچہ اپنی کتاب جہاد کشمیر میں یہ عاجز پاکستان کے وجود میں آنے کو اس طرح بیان کرتا ہے۔

''پاکستان کیوں بنا اور کیسے بنا۔ اور پھر دنیا کی سب سے بڑی اسلامی سلطنت کے طور پر وجود میں آنے کے بعد جلد ہی مشکلات میں پھنس گیا۔ حتیٰ کہ ۲۴ سال کے اندر دولخت ہو گیا۔ یہ سوالات ہر ہوشمند پاکستانی کے ذہن میں ابھرتے ہیں۔ مگر کسی کے پاس اس کا صحیح جواب نہیں ہوتا۔ ہر سوچنے والا اور بظاہر دانشور پاکستانی اپنی اپنی بساط کے مطابق کچھ نہ کچھ بڑبڑاتا ہے۔ مگر پھر اپنے تجربہ کو ناکارہ سمجھنے لگتا ہے۔ تاہم اگر تامل سے غور کیا جائے اور تمام حقائق پر پوری نگاہ ڈالی جائے تو جواب صاف نظر آ جائے گا۔ میرے نزدیک پاکستان کی تخلیق ایک فرد واحد کی یکسوئی، فراست اور کاوش کا نتیجہ تھی''۔

91۔ یہ عاجز پاکستان کے وجود میں آنے کی وضاحت پیراگراف نمبر 30 میں بھی کر چکا ہے۔ البتہ اس کی ایک روحانی وجہ بھی ہے کہ غازی مرید حسین، غازی علم الدین، غازی عبدالرشید، غازی ملک میاں محمد، غازی دوست محمد،

غازی عبدالقیوم، غازی محمد صدیق، غازی محمد عبداللہ، غازی امیر احمد، غازی محمد منیر اور متعدد گم نام غازی ناموس رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر قربان ہو گئے۔ تو اللہ تعالیٰ نے ہمیں ایک خطہ عطا کر دیا کہ ہم میر عرب ﷺ کو یہاں سے ٹھنڈی ہوائیں پہنچائیں۔ بات وکالت کی تھی اور میر عرب ﷺ کی وکالت اللہ تعالیٰ نے ایک با اصول اور دیانتدار وکیل کو سونپ دی جو محمد علیؒ تھا۔ اس کو ہمارا راہبر اعظم یا قائداعظم بنا دیا ہمارے دلوں کو بھی پھیر دیا اور ہمارے لیے ''مواقع تقدیر'' پیدا کر دیئے کہ ہم اس کے حبیب ﷺ کے بتائے ہوئے طریقوں کو اپنا کر نظامِ مصطفیٰ ﷺ اور نظامِ جہاد کو جاری وساری کر دیں۔ ہم نے کیا کچھ کیا۔ اپنی ان کوتاہیوں کو یہ عاجز متعدد کتابوں اور سینکڑوں مضامین میں بیان کر چکا ہے۔ اور اس کتاب میں ان کوتاہیوں پر کئی تناظر سے تبصرہ ہو چکا ہے۔ ایک کتاب کے چند الفاظ یہاں پیش کیے جاتے ہیں۔

''اور تخلیق کے وقت اس مسلمان سلطنت میں اسلام کا ایک مضبوط قلعہ بننے کے تمام لوازمات موجود تھے۔ مگر ایسا اس لیے نہ ہو سکا، کیونکہ ہم نے کشمیر کو میدان جنگ میں حاصل کرنے سے گریز کیا۔ پاکستان کی تمام مصیبتیں اس کی بتدریج پسپائی، آپس کی سر پھٹول اور خانہ برانداز سیاست کی اصلی وجہ یہی خون کے کھیل سے اجتناب ہے۔ پاکستان کی جنگ آئینی اس لیے تھی کہ غالب طاقت یعنی انگریز کسی اور کھیل کو برداشت کرنے کے لیے تیار نہ تھا۔ مگر پاکستان بن جانے کے بعد بھی اس کھیل سے مستقل گریز اپنے حکمرانوں، دانشوروں اور جرنیلوں کی کوتاہ بینی

کا نتیجہ ہے''۔

92۔ اگر 1947-48ء کے جہاد کشمیر کو اس کے منطقی نتیجہ تک پہنچا دیا جاتا۔ اور کشمیر کو بزور شمشیر ہندو سے چھین کر پاکستان کا حصہ بنا دیا جاتا تو پاکستانی قوم کے اندر نئی قوت از خود جنم لے لیتی۔ یہ جو مجید نظامی رٹ لگا تا رہتا ہے کہ پاکستان سیاسی عمل کی پیداوار ہے اور اس کا فرانہ سیاسی نظام کو صحیح طور پر اپنا کر ہم کشمیر بزور شمشیر حاصل کریں، اس بے چارے کو یہ معلوم نہیں کہ یہ کچھ ''قل ھواللہ والی شمشیر'' سے تو حاصل کیا جا سکتا ہے اور جہاد کو طرز زندگی بنائیں تو تب ایسا ہو سکتا ہے اور ہم نے 1947-48ء کا سنہری موقع کھو دیا۔ اس سلسلہ میں اس عاجز کی کتاب ''جہاد کشمیر'' کے چند الفاظ یہاں پیش کیے جاتے ہیں۔

''کہ ہندو قوم میں اس وقت تک سپاہیانہ خواص نے جنم نہیں لیا تھا۔ لیکن افسوس کہ ہمارے ہر سطح اور قطع کے رہنما یہ سمجھنے سے عاری ہیں کہ میدان جنگ کی فتح کسی قوم کے نفسیات میں حیرت انگیز تبدیلی پیدا کرتی ہے۔ ایسی تبدیلی ہم پاکستانی مسلمانوں میں بھی پیدا ہوتی۔ ہم نئے ارادوں اور امکانات سے سرشار ہو کر اپنے اندر ناقابل شکست استحکام پیدا کرتے۔ پھر نہ صوبائی عصبیت کا وجود ہوتا نہ لسانی جھگڑے دکھائی دیتے۔ ہوتا یہ کہ پاکستان کے دولخت ہونے کی بجائے بھارت ریزہ ریزہ ہو جاتا۔ ہم نے یہ نادر موقع جو فطرت نے ہمیں ابتداء ہی میں فراہم کیا تھا اپنے حکمرانوں اور نوکر شاہی کی کم فہمی، بزدلی اور خود فریبی کی وجہ سے ضائع کر دیا۔ اس میں کون لوگ مجرم تھے اور کن

اشخاص نے اور کہاں کہاں غفلت اور بے عقلی سے یا دانستہ طور پر
جہاد کشمیر کو ناکام کیا؟ کیوں ایک شجاع، خون آشنا، اور موت سے
بے خوف قوم کی تمام قربانیاں کارگر نہ ہوسکیں؟ یہ ایک المناک
داستان ہے جو مستقل طور پر نگاہوں سے اوجھل رکھی گئی ہے''۔

93۔ اس عاجز کو اللہ تعالیٰ سبحانہ' نے تحریک پاکستان میں بھرپور شرکت کی سعادت عطا فرمائی تھی۔ ہندو کانگرس کے توڑ کے طور ISPR میں ہونے کی وجہ سے مجھے ہر مسلمان فوجی تک پاکستان کی ضرورت کا پیغام پہچانے کا موقع ملا تھا۔ ہر مسلمان اخبار یا اخبار نویس کے ساتھ رابطہ باندھ کر ان کی کئی طرح سے مدد کی اپنے علاقہ ضلع خوشاب میں خضر حیات ٹوانہ کے غلط پروپیگنڈوں کا قلع قمع کیا۔ اس لیے جب 1948ء میں کشمیر میں جہاد اصغر کو بھی جمود دیا جا رہا تھا تو یہ عاجز کئی سازشوں کے تحت کوتاہیوں کو بھی بھانپ چکا تھا۔ تو میں نے پروٹیسٹ کیا۔ عہدہ بہت چھوٹا تھا۔ مجھے ایڈورس رپورٹ پر رکھ دیا گیا۔ لیکن میں نے نوکری نہ چھوڑی کہ

پیوستہ رہ شجر سے امید بہار رکھ

تو اس عاجز نے ''رہنما'' تلاش کرنے شروع کردیئے۔ اور اسی زمانے میں مجھے معلوم ہوگیا کہ یہاں قحط الرجال ہے اور پیرا 22 میں جو میں نے لکھا ہے کہ ستمبر 65ء کی جنگ نے ان ''شخصیتوں'' کے ریت پر تعمیر قلعے ظاہری طور پر مسمار کردیئے ہیں۔ مجھے 1948ء میں ہی معلوم ہوگیا تھا کہ ہم بہت ''کم علم'' اور مومن کی فراست سے عاری قوم ہیں۔ اور پیرا نمبر 33 تا 40 میں اس عاجز نے مختصر طور پر بیان بھی کردیا ہے کہ ہمارے یہ رہنما اور ملک کے سربراہ کس عبرتناک انجام سے دوچار ہوئے۔ اس لیے 1949ء

میں مجھے ایک ''ہم خیال'' کرنل شیر محمد مل گئے جنہوں نے روایتی اسلامی علوم میری طرح ''اعوان قاری'' کے بزرگوں کے سینے سے حاصل کئے تھے۔ اور گو عمر میں مجھ سے چند ماہ بڑے تھے لیکن مجھ سے بہت سینئر اور صاحبزادہ یعقوب اور ایئر مارشل اصغر خان کے ''نمبری'' تھے۔ شیر محمد نے کرنل خالد کا نام اپنا کر 1948ء کے شروع مہینوں میں چند مجاہدین کے ذریعہ سے ٹیٹوال، ہندواڑہ، ایک محاذ کھول کر بھارتی جنرل تھمایا کو ایسے چکروں میں پھنسا دیا کہ اس نے مظفر آباد کو فتح کرنے کی تجویز کے بارے سوچنا بھی بند کر دیا۔ بعد میں شیر محمد، وسطی کشمیر میں کھورٹہ کے اگلے علاقہ کا سیکٹر کمانڈر بھی رہا۔ فائر بندی پر اس نے بھی احتجاج کیا لیکن شیر محمد کو 1948ء کی آخری سہ ماہی میں کرنل کے عہدہ پر ترقی دے کر کوہاٹ میں ایک پلٹن کی کمانڈ سونپ دی گئی۔

94۔ 1952ء میں انہیں تمام آزاد کشمیر پلٹنوں کے سنٹر کی کمانڈ دے کر حکم دیا کہ ان پلٹنوں کی تنظیم بھی پاکستان آرمی کی باقی پلٹنوں کی طرح کی جائے۔ بعد میں راولاکوٹ کے سیکٹر کی کمانڈ بھی کی اور گلگت، سکردو، وغیرہ تمام ایریا کی کمانڈ جو آج کل میجر جنرل کی کمانڈ ہے۔ بہر حال آپ کے خیالات چونکہ اسلامی تھے تو آپ کو مزید ترقی بھی نہ دی اور 1962ء میں وقت سے پہلے فوج سے ریٹائر کر دیا۔ آپ جہاں رہے اس علاقے کو درود و سلام کی محفلوں کے ذریعہ معطر رکھا اور مغربی دفاعی نظام کی کھلم کھلا مخالفت کرتے ''نظریہ جہاد کو اپنانے پر زور دیتے رہے۔ ریٹائر ہونے کے بعد یہی عمل ''سول'' میں جاری رکھا اور تحریک اخوان المسلمون کے ذریعہ سے پوری قوم کو اللہ تعالیٰ کی فوج بننے کا پیغام بھی دیا اور پیرا 65 میں ذکر ہو چکا ہے کہ سردا

عبدالقیوم کی تحریک مجاہد کے کرتا دھرتا بھی یہی کرنل شیر محمد تھے۔ ہم نے جو ایک دوسرے سے علم حاصل کیا، وہ کئی صفحات کا مضمون ہے۔ بس موٹے طور پر یہ سمجھ لیں کہ جب کسی ایک چھاونی میں ہوتے تھے تو روزانہ اور باقی جب موقع ملتا کئی ''گھنٹوں'' کی بیٹھکیں کرتے تھے۔ شاید ہی دنیا میں کسی نے علم کے حصول کے لیے اتنی لمبی ''بیٹھکیں'' کی ہوں۔ یعنی تقریباً چالیس سال کے عرصہ میں اکثر روزانہ تین چار گھنٹے بامقصد عملی علم کے حصول زیر بحث رہتے تھے۔ اس لیے قارئین کو جو کچھ میری تحریروں میں نظر آئے اس میں کرنل شیر محمد برابر کا ''شریک'' ہے۔

95۔ میرا عہدہ جونیئر تھا۔ اکثر اپنے نمبریوں میں عمر کی وجہ سے میرا مقام ''لالہ'' والا تھا، کہ فوج میں تو جنرل یحیٰی خان وغیرہ اور ہم ایک ہی سال 1938ء میں آئے۔ اور پاکستان بننے کے بعد تقریباً ڈیڑھ ہزار افسران جو پاکستان کے حصے میں آئے ان میں سے کوئی ایسا نہ ہوگا جو میرا ''شناسا'' نہ ہو۔ فوج میں شرابی کبابی اور بے دین افسروں کا بھی ایک گروہ تھا۔ اور یہ عاجز اپنے مضامین میں جنرل حق نواز، جنرل ملک شیر بہادر، جنرل فضل مقیم، بریگیڈیئر گلزار احمد، بریگیڈیئر نثار قریشی، کرنل شیر محمد، اور کرنل حفیظ آفریدی وغیرہ متعدد خاندانی افسران کا ذکر کر چکا ہے۔ جنہوں نے فوج میں لادینیت کو نہ پھیلنے دیا۔ اور بے شک اللہ تعالیٰ کی ذات پاک کی خاص مہربانی سے ایسے لوگوں کو میری ذات میں ایک ''دبنگ'' رفیق میسر تھا۔ جو کھل کر بے دین لوگوں کو منہ پر ان کو نہ صرف کھری کھری سناتا رہتا تھا۔، بلکہ بعض دفعہ ایسے لوگوں کی ایسی تیسی بھی کی۔ اس لیے فوج کی اکثریت کھلم کھلا طور پر اپنے آپ کی اسلام کے ساتھ وابستگی کا اعلان کرتی

رہتی تھی اور ہم اسلامی اقدار کو اپنانے کی راہیں ڈھونڈتے رہتے تھے، اور گو ہم نظریہ جہاد کو اس طرح ایک اپنی قسم کے فلسفہ کے طور پر تو نہ سمجھتے تھے، جو سوجھ ستمبر 65ء کی جنگ کے بعد آنا شروع ہوئی۔ لیکن جذبۂ جہاد ہمارا اوڑھنا بچھونا تھا۔ اور ہم ایسی تربیت پر زور دیتے تھے کہ سپاہی کو عشق رسول ﷺ میں ڈوب کر میدان جنگ میں داخل ہونا چاہیے۔ اور افسوس کرتے تھے کہ کشمیر کے 48-1947ء کے جہاد یا جنگ میں ہمارے انگریز جنرلوں نے ہمیں باندھ کر بھارتی سورماؤں کے سامنے ''نکو'' بنایا اور ہماری مرضی کی لڑائی نہ لڑنے دی۔ لیکن اب اگر بھارت کے ساتھ جنگ ہوئی تو ہم دہلی سے ادھر نہ رکیں گے۔

96۔ ستمبر 65ء کی جنگ سے دو تین سال پہلے میری حیرانگی کی کوئی حد نہ رہی کہ پیدل فوج کی نفری کم کی جا رہی تھی۔ جو ملک میں وافر تعداد میں ''موجود'' تھی۔ اور فائر پاور پر زیادہ بھروسہ کیا جا رہا تھا جو باہر سے ''منگوانا'' پڑتا تھا۔ دراصل یہ ایک سازش تھی کہ جنرل عبدالحمید برہمی (یحییٰ کے سایہ) سے لڑائی لڑنے کا ایک نیا طریقہ بنوایا جا رہا تھا، جو جنگ میں ایک دن بھی نہ چلا اور ہم نے اپنے طریقوں سے جنگ لڑی۔ ستمبر 65ء کی جنگ کی سازشوں، غداریوں، کوتاہیوں اور نالائقیوں کا ثبوتوں کے ساتھ بے شمار مواد میرے پاس موجود ہے کہ ہماری نادان، کم علم اور مومن کی فراست سے عاری قوم کو کس طرح بے وقوف بنایا گیا، کہ یہ ہماری فتح تھی۔ اگر یہ ہماری فتح ہوتی تو ملک چھ سال بعد دولخت نہ ہو جاتا۔ ستمبر 65ء کی جنگ نے ہمیں ننگا کر دیا، کہ پاکستان میں صرف میجر کی سطح تک لوگ جنگ لڑنا جانتے ہیں۔ اس سے اوپر کے لوگ اوپر والی ذمہ داریوں سے بالکل ''نابلد'' ہیں۔ اور تب ہی

اخباروں میں ستمبر 65ء کی جنگ کو میجروں کی جنگ کہا جانے لگا۔ اور یہ عاجز پیرا22 میں ذکر کر چکا ہے کہ اس کے بعد پاکستان کے ان بڑوں کی وقعت دھیلے کے برابر نہ رہی۔ اور میں ملک کے سربراہوں سمیت سب کو ان کے منہ پر کہہ دیتا تھا کہ وہ کیسے عبرتناک انجام سے دوچار ہوں گے۔

97۔ جنگ کی تجاویز یا فوجی تزویرات اور حکمت عملیاں، صرف ''متعلقہ'' لوگوں کو معلوم ہوتی ہیں۔ لیکن ہم چھوٹے لوگ گو اعتراض نہیں کر سکتے کہ جنگ میں ''جمہوریت'' نہیں ہوتی۔ البتہ ہمیں کافی حالات معلوم ہو جاتے ہیں اور 1965ء کے رن آف کچھ کے جھگڑا کے وقت جب فوجوں نے محاذ سنبھالا تو ہم پر ظاہر ہو گیا کہ ہمارے پاس پیدل فوجوں کی بہت کمی ہے۔ اور ہم نے اپنی پلٹن کی Intelligence Reports میں اپنے ان ''خدشات'' کا اظہار کیا۔ یہ تو بعد میں معلوم ہوا کہ وہ ایک ''ڈرامہ'' تھا کہ ایوب خان اور اس کے حواریوں کو بے وقوف بنانا تھا کہ وہاں ہماری جارحانہ کاروائی کے باوجود بھارتی خاموش رہے۔ اور اگر ہم نے کشمیر میں گوریلہ کاروائی کی، تو بھی بھارت ''خاموش'' رہے گا اور پاکستان پر حملہ نہ کرے گا۔ اس لیے تیسرا حصہ فوج کو چھٹی بھیج دیا۔ اور محاذ سے تمام رکاوٹیں ہٹا کر پرامن صورت حال کا مظاہرہ کر کے بغیر کسی تیاری کے فوجی لوگوں کو بھٹو اور اختر ملک کی سازش کے تحت کشمیر کے اندر ''جھونک'' دیا۔ ہم نے سوچا کہ خفیہ طور پر ہمارے سنٹروں میں کچھ پلٹنیں کھڑی کی جا رہی ہوں گی۔ اور جنگ شروع ہونے کے بعد ستمبر اور اکتوبر 65ء میں جو پلٹنیں کھڑی کیں وہ اگر اگست 65ء میں کھڑی کر دی جاتیں تو تاریخ کا دھارا تبدیل ہو سکتا تھا، کہ دہلی تک پہنچنے میں ہمیں کوئی نہ روک سکتا تھا، کہ توپخانہ

اور بکتر بند دستوں کے معیار اور خاصیتوں میں ہم بھارت سے بہت اوپر تھے۔ اور جہاد کا جذبہ ہمارے پاس ''فالتو'' تھا۔ اور پیدل فوج کے وافر ہونے کے بعد بھارت ہمارے لیے تر نوالہ تھا۔

98۔ لیکن اندرونی اور بیرونی سازشیں بہت گہری تھیں جو بعد میں عیاں ہوئیں کہ لاہور بھارت کو ''پلیٹ'' پر دے کر وہ کچھ کرنا تھا جو ہمارے ساتھ دسمبر 1971ء میں ہوا۔ بہرحال جب نئی فوج کھڑی ہوتی نظر نہ آئی تو ہم خیال افسروں میں اس عاجز نے شور مچانا شروع کر دیا کہ جو کچھ کشمیر میں ہو رہا ہے بھارت خاموش نہیں رہ سکتا۔ تو سازش اتنی گہری تھی کہ مجھ چھوٹے سے میجر کو بھی ''محاذ'' سے ہٹانے کے لیے مردان پوسٹ کر دیا۔ میں نے represent کیا، کہ مجھے جنگ نظر آ رہی ہے اور میں یہ جنگ ان رفقاء کے ساتھ رہ کر لڑنا چاہوں گا جو پچھلے پانچ سال سے میرے ساتھی یا تربیت یافتہ ہیں۔ سازش والے ہمارے نادان بڑوں کو اس طرح برین واش کرنے پر لگے ہوئے تھے کہ میرا بریگیڈ کمانڈر کھلے طور پر مجھ پر ''برس'' پڑا، کہ ''کیا جی ایچ کیو والے اور سب اوپر والے نادان ہیں اور میں اکیلا روشن ضمیر آدمی ہوں کہ حالات کو صحیح طور پر بھانپ رہا ہوں'' عرض کی کہ ''جناب مجھے عام سا میجر نہ سمجھیں اور اپنے عہدہ کا ''رعب'' اپنے پاس رکھیں۔ اور میری درخواست پر جو چاہو افلاطونی بکھیر دو۔ تم اس کو روک نہیں سکتے۔ جی ایچ کیو نے اگر میری بات کو رد کیا تو صدر ملک کے پاس جانے سے بھی گریز نہ کروں گا۔'' سنتے ہیں کہ جی ایچ کیو میں کوئی صاحب یہ سب کچھ پڑھ کر حیران ہوا کہ لوگ جنگ سے فرار ہوتے ہیں کہ یہ کوئی ''سر پھرا آدمی'' ہے۔ تو اس کی بات میں ''وزن'' ہو گا۔ اور سوچ شروع ہو گئی اور

اتنے میں جنگ شروع ہوگئی جس نے سب فیصلے کر دیئے اور میں لاہور میں رکا ہوا تھا۔

99۔ کشمیر میں جو فوجی، گوریلے بنا کر جھونک دیئے گئے تھے انہوں نے بڑی بہادریاں بھی دکھائیں۔ کچھ شہید ہوئے۔ کچھ پکڑے گئے۔ بھارت والوں کو ہماری کمزوری معلوم ہوگئی۔ انہوں نے فائر بندی لائن کی خالی کی ہوئی جگہوں اور کمزور جگہوں پر قبضہ شروع کر دیا۔ تو آزاد کشمیر والا معاملہ بھی ختم ہونے لگا تو پنجاب محاذ پر ذمہ داری والی پیدل فوج کو وہاں سے اٹھا کر آزاد کشمیر بھیجنا شروع کر دیا۔ تو پنجاب محاذ پر پیدل فوج کی کمی ہوگئی، بلکہ ایک پیدل فوج کے بریگیڈ سے غلط مقام چن کر چھمب جوڑیاں پر حملہ کرا دیا گیا۔ حیران کن کاروائی سے بنیادی طور پر کامیابی ہوئی لیکن یہ فوج ایک تنگ محاذ پر قدرتی طور پر ایک ''فنل'' میں گھس گئی یا ''گھسیڑ'' دی گئی۔ تو اس صورت حال کو بہتر کرنے کے لیے قصور محاذ سے بکتر بند دستوں کے ایک مددگار پیدل فوج بریگیڈ کو بھی چھمب لانا پڑ گیا۔ اب فضائی فوج سمیت جب دونوں طرف والے گھمسان جنگ میں لگے تھے، تو یہ سوچنا بڑی بے وقوفی تھی کہ یہ جنگ کشمیر تک ''محدود'' رہے گی۔ لیکن ہم تو لاہور شہر میں بیٹھے تھے اور باقی فوج لاہور چھاؤنی میں تھی۔ حفظ ما تقدم کے طور پر بھی فوجوں کو ہمارے پروٹیسٹ کی وجہ سے بہت دیر کے بعد اجازت ملی کہ 5/6 ستمبر شام کو اندھیرا پڑنے پر دیکھ بھال والے دستے آگے جائیں اور زیادہ فوج 6 ستمبر سورج کے نکلنے کے بعد آگے جا سکتی تھی۔ (توبہ میرے اللہ)۔

100۔ پیدل فوجوں کی کمی کی وجہ سے ہماری پلٹن کی جو ضلع شیخوپورہ میں مقبول پورہ میں ذمہ داری تھی، اس کے لیے اب صرف کیپٹن صفدر (بعد میں جنرل اور

گورنر) کی کمپنی کو ذمہ داری دی گئی کہ پلٹن کا سیکنڈ ان کمانڈ میجر (بعد میں جنرل) غلام حسن سولین مجاہدوں کی مدد سے اس علاقہ کا دفاع کرے گا۔ اور مجھے پہلے حکم مل گیا تھا کہ میں ان سولین مجاہدوں کو کمانڈر کیپٹن رانا کے سپرد کر دوں، باقی پلٹن کو واہگہ محاذ پر تتر بتر بھی کر دیا گیا اور ایک کمپنی کو جوابی حملہ کا مرکزی کام سونپا گیا۔ پلٹن کا کرنل گول والہ پارسی تھا۔ اور نیا نیا پلٹن میں آیا تھا۔ وہ صرف میجر غلام حسن اور مجھے جانتا تھا۔ غلام حسن اس سے الگ کر دیا گیا۔ تو گول والہ یہ نہ چاہتا تھا کہ میں مردان جاؤں۔ اس نے میرے کندھے پر ہاتھ رکھ کر مجھے ہر مشورہ میں شریک کرنا شروع کر دیا۔ اور پلٹن کو محاذ کے پھیلاؤ کی وجہ سے جگہ جگہ پھیلانا تھا، تو مجھے اپنے پرانے ہانڈیوال میجر صادق کے ذریعہ سے معلوم ہو گیا کہ اوپر والے ہمارے ساتھ ٹرانسپورٹ کا ''جھوٹا وعدہ'' کر رہے ہیں۔ سب گاڑیاں یحیٰی خان کو چھمب کی فتح میں شرکت یا ''پانچوں سواروں'' میں شامل کرنے کے لیے اس کے ''دستوں'' کو دے دی گئی ہیں۔ کہ تقریباً دس بارہ پیدل پلٹنیں اس فنل میں ''پھنسا'' دی گئی تھیں، کہ ہماری جاہل اوپر والی کمانڈ کے کرتا دھرتا، اکھنور، جموں، پٹھانکوٹ، گورداسپور کے راستے دہلی ''فتح'' کرنا چاہتے تھے اور ان کا خیال تھا، کہ امرتسر، جالندھر، لدھیانہ اور فیروز پور کی افواج خاموش ''تماشائی'' بن کر مشرقی پنجاب میں بیٹھی رہیں گی۔ چھمب جوڑیاں کی تمام تر کاروائی سے اگر اکھنور پر قبضہ ہو بھی جاتا تو صرف بھارت کے دو ڈویژن افواج کی سپلائی لائن ''متاثر'' ہوتی۔ اور اگر کشمیر میں بھارتی ساری فوج کی ناکہ بندی کی کوئی تجویز بنانا بھی تھی، تو شکر گڑھ سے سانبہ یا پٹھانکوٹ کی طرف معمولی پیش قدمی کسی کھلے محاذ پر کر کے بہت کچھ حاصل کیا جا سکتا تھا۔

تو پھر اس زمانے میں تو بھارت کا بکتر بند ڈویژن بھی ان علاقوں میں آ چکا تھا، اور اس کو ''جال'' میں ''پھنسانا'' آسان تھا۔

101۔ ایک ایک کوتاہی پر کیا رونا رویا جائے۔ مجھے جو گول والہ کے ''مشیر'' کے طور پر مرکزی مقام حاصل ہو گیا۔ تو اوپر والوں کو عرض کی کہ دیکھ بھال روشنی میں کی جاتی ہے اور بڑی فوج ''چھپ'' کر اندھیرے میں ان دیکھ بھال والے دستوں کی مدد سے اپنی ذمہ داری سنبھالتی ہے۔ انہوں نے یہ الٹا حکم کیوں دیا ہے، تو معلوم ہوا کہ وہ ایک ''بین الاقوامی ضرورت'' ہے کہ 5/6 ستمبر کو کچھ غیر ملکی مہمان شام کے وقت بھارت سے آ رہے ہیں۔ ان سے ''پردہ'' کی ضرورت ہے کہ ہم نہیں چاہتے کہ یہ کہا جائے کہ پاکستان نے اپنی فوجیں آگے کر کے بھارت کو اشتعال دلایا ہے۔ توبہ میرے اللہ۔ چھمب جوڑیاں میں ڈویژن کے برابر فوجوں کا ٹکراؤ اور فضائی فوج کا استعمال، اشتعال نہیں۔ بھٹو اور عزیز احمد ہمیں خوب بے وقوف بنا رہے تھے۔ اوپر والوں کو عرض کی کہ '' واہگہ روڈ پر کرفیو لگا رہے۔ ہمیں باقی جگہوں پر تو بروقت پہنچنے دو''۔ یہ تو بعد میں معلوم ہوا کہ شاستری کو جنگ میں دھکا دینے کے لیے غیر ملکی مہمانوں کے ڈرائیور بھارتی افسر تھے جنہوں نے رپورٹ دینا تھی کہ محاذ خالی ہے۔ اور لاہور محاذ کے سینئر افسران جنرل سرفراز اور بریگیڈیئر قیوم شیر کو اس بین الاقوامی پارٹی میں '' نشے میں دھت'' کرنا تھا، کہ وہ لوگ 6 ستمبر نو بجے بستروں سے اٹھے جب تک ہم بھارتیوں کے دو حملے پسپا کر چکے تھے۔ اور بریگیڈیئر قیوم شیر کے بریگیڈ کی یونٹیں چھاؤنی میں پی ٹی پریڈ کر رہی تھیں۔

102۔ قارئین بہت ساری باتیں بعد میں ظاہر ہوئیں یا معلوم ہوئیں۔ لیکن یہ عاجز

ہر معجزہ کا کچھ چشم دید گواہ ضرور تھا۔ صبح سویرے جو بھارتی قیدی پکڑے تو وہ حیران تھے اور کہتے تھے کہ ان کو تو بتایا گیا تھا۔ پاکستانی فوج چھاؤنی میں ہو گی اور 6 ستمبر سورج چڑھے وہاں سے نکلے گی، تم لوگ محاذ پر کیسے پہنچ گئے ہو؟ اللہ تعالیٰ کا کرنا ایسے ہوا کہ جیسے یہ عاجز اوپر والوں سے واہگہ روڈ کو چھوڑ کر باقی علاقوں میں جانے کی ''محدود اجازت'' حاصل کر سکا تو لاہور شہر میں ہونے کی وجہ سے میں داتا صاحبؒ کے مزار پر حاضر ہوا۔ بڑی مشکل سے دو رکعت نفل ادا کیے کہ کسی غیبی طاقت نے زور دینا شروع کر دیا کہ دیر مت کرو، محاذ پر پہنچو۔ تو میں نے پلٹن میں پہنچ کر جو گاڑی ملی اس کے ذریعہ سے اپنے جوانوں کو محاذ پر 5 ستمبر دوپہر سے پہلے بھیجنا شروع کر دیا کہ ٹرانسپورٹ کم ہے۔ اپنی گاڑیاں بار بار چکر لگاتی رہیں۔ چونکہ ہماری پلٹن کو سارے واہگہ محاذ پر ''بکھیر'' دیا گیا تھا، تو چھاؤنی کے ہر علاقے سے ہماری گاڑیوں کو دیکھ کر اور لوگوں نے بھی محاذ پر جانا شروع کر دیا۔ بلوچ پلٹن نے البتہ کیپٹن مسعود کو بھیانی پل پر دیکھ بھال کے لیے رکھا ہوا تھا۔ جس کا میں ''لالہ'' تھا اور اس دن میں نے بھیانی پل کے پیچھے ہی جمگاہ کرنا تھی۔ اور مسعود کو پیغام بھیجا کہ چونکہ تم اگلے محاذ کے کمانڈر ہو تو میں یہ رات آرام سے سو جاؤں گا۔ دشمن کی حد باٹا پور سے آگے کئی میلوں کے بعد آتی ہے۔ بھیانی سے دشمن ایک میل سے بھی کم فاصلہ پر ہے۔ مسعود نے نہ صرف دشمن کو اس کے پہلے حملہ میں تہس نہس کر دیا بلکہ ایک اینٹی بکتر بند گن کے فائر سے سب فوج کو چوکنا کر دیا۔ اور ایک ایک معجزہ کئی کتابوں کا مضمون ہے کہ 6 اور 7 ستمبر کو بھارتی فوجوں کا بڑا حصہ بی آر بی کے سامنے تہس نہس ہو چکا تھا۔

103۔ ہمارے بڑوں کی البتہ ہر تجویز غلط تھی اور ان کے مطابق جوابی حملہ تب کرنا تھا جب دشمن بی آر بی کو پار کر لے۔ یہ بڑی غلط سوچ تھی۔ ہم نے حالات کا فائدہ اٹھایا اور 8 ستمبر کو ہی بھارتیوں کے نقصانات کے مدنظر ہم نے بی آر بی کے آگے رانی پوسٹ وغیرہ یا شمشیر پوسٹ پر دوبارہ قبضہ کر لیا۔ تو اوپر والوں کو کچھ حوصلہ ملا۔ اور 9 ستمبر کو ایک ملے جلے جوابی حملہ کی اجازت مل گئی۔ جس کی تاب نہ لا کر بھارتی جنرل نرنجن پرشاد جو دیکھ بھال کے لیے آگے آیا ہوا تھا۔ اپنی جیپ کو چھوڑ کے پیدل ہی ''فرار'' ہو گیا۔ ہمارا میجر نذیر گل سخت زخمی ہو گیا تھا۔ اس کی جگہ لینے میں اس علاقہ میں ستمبر 9/10 کی آدھی رات پہنچا۔ اور سویرے میجر مبارک کی A کمپنی نے حملہ کرنا تھا۔ اور میں ان کے ساتھ ساتھ چل رہا تھا کہ جہاں وہ لوگ رک گئے میں اپنی کمپنی کو آگے بلا لوں گا۔ لیکن میجر مبارک جلدی شہید ہو گیا۔ اور مجھے A کمپنی کی کمانڈ سنبھالنا پڑ گئی۔ ہم واہگہ کے قریب پہنچے تو حکم ملا پیش قدمی ختم کر کے چودھویں میل کے علاقہ میں واپس آئیں۔ کہ قصور محاذ کا ہمارا حملہ بھی رک گیا ہے۔ اور بھارتیوں کا بڑا حملہ سیالکوٹ محاذ پر ہو گا۔ تو لاہور محاذ پر ''ساکن'' ہونا ہو گا۔ یہ بڑی غلط پالیسی تھی۔ دفاع میں بھی جارحانہ عمل ضروری ہوتا ہے۔ اور ہمیں ایسی جگہ بی آر بی کے آگے پوزیشن لینے کے احکام ملے جہاں کوئی رکاوٹ نہ تھی، تو ہم نے چھوٹی سطح پر دستے آگے نکال کر اپنے دفاع کو کچھ ''جارحانہ'' بنایا، کہ میجر گل کی بی کمپنی کی کمانڈ سنبھالنے کے لیے کیپٹن صغیر نے آ کر لفٹیننٹ افتخار سے چارج لے لیا۔ لیکن 11/12 ستمبر سورج غروب ہونے کے فوراً بعد حکم ملا کہ ہم اپنی یہ پوزیشن خالی کر کے واپس بی آر بی کے نئے پل والے علاقے میں پہنچ

جائیں۔ہم نے اس حکم کوکسی سازش کی کارستانی سمجھا کہ لاہور کا دفاع بی آر بی سے آگے رہ کر ہی کیا جا سکتا تھا۔ پھر میں گشتی دستوں کے ساتھ خود دیکھ آیا تھا کہ دشمن واہگہ سے اٹاری کی طرف فرار ہورہا تھا تو ہم نے اس حکم کے خلاف پروٹیسٹ کیا، جو وقتی طور پر تو ''منظور'' کرلیا گیا لیکن بعد میں سخت حکم ملا کہ جلدی پسپا ہوکر نئے پل کے پاس پہنچیں۔وہاں گول والہ مجھ سے پہلے پہنچ گیا تھا۔ میں سب سے آخر میں پہنچا، تو بریگیڈیئر قیوم شیر سٹ پٹائی حالت میں کہنے لگا میں جلدی اپنی کمپنی کو پل کے پار پیچھے لے جاؤں، میں نے پسپائی میں بہت دیر کردی ہے کہ قیوم شیر نے اس پل کو اڑانے کے احکام دیئے ہیں۔ میں خاموش نہ رہ سکا اور پوچھا کہ یہ افراتفری کیسی ہے؟ چند گھنٹے پہلے میں واہگہ تک کا چکر لگا آیا ہوں اور دشمن ہماری طرف کوئی حرکت نہیں کررہا ہے اور ہم نے یہ ''بھاگڑ'' کیوں مچائی ہوئی ہے۔ قیوم شیر کہنے لگا ''تمہیں کیا معلوم ہے دشمن کے تین ٹینکوں نے راوی سائفن پار کرلیا ہے۔'' میں نے کہا میدان جنگ کی صورت حال کے مطابق یہ خبر غلط ہے، کہ وہاں پر 15 بلوچ کا بی ایچ لان اور لنگر ہے اور پلٹن چھ سات میل آگے بھارتی علاقوں منجھ اور ککڑ پہنچی ہوئی ہے۔ تو بریگیڈیئر قیوم شیر کہنے لگا کہ پھر ہڈیارہ سائفن کو پار کیا ہوگا۔ میں نے کہا وہ تو اکاڈٹ ہے اور نیچے کیچڑ اور نالہ ہے، وہاں سے کوئی ٹینک گزر ہی نہیں سکتا۔ اتنے میں 18 بلوچ کا میجر (بعد میں جنرل) غلام محمد بھی وہاں پہنچ گیا، تو میں نے مزید کہا کہ سنی سنائی غلط خبروں پر غلط کارروائی ہورہی ہے۔ راوی سائفن کو وہ پار کرسکتا ہے۔ جس کا اس کے جنوب میں تقریباً ایک میل تک بی آر بی کے دونوں کناروں پر قبضہ ہو۔ بھارت والے وہاں کیسے پہنچ گئے؟ اور اگر ایسا ہو

بھی گیا ہے تو رات کے وقت بھارت کے یہ ٹینکس ہمارا کیا ''بگاڑ'' لیں گے۔ غلام محمد بھی ان لوگوں میں تھا جن کا میں ''لالہ'' تھا۔ وہ کہنے لگا لالہ کی باتوں میں ہمیشہ بڑا ''وزن'' ہوتا ہے۔ اور اس کی سفارش کے مطابق فی الحال پل نہ اڑایا جائے۔ اور حالات کی چھان بین کی جائے۔

104 - کیا چھان بین ہوئی اور جنگ کے بعد اپنے طور پر اس غلط کاروائی کی میں نے خود بھی چھان بین کی۔ کہ ہمارے اوپر والے فوجی، فراست سے بھی عاری تھے اور مومن کی فراست سے بھی۔ اور تمام کہانی بہت لمبی ہے کہ جاہلانہ طور پر غلط افواہ کی وجہ سے یہ غلطی کی گئی۔ 12 ستمبر صبح سویرے ''ڈرتے ڈرتے'' قدم رکھتے گول والہ میرے پاس آیا اور کہنے لگا، ''امیر افضل تم نے جو قیوم شیر کی لوگوں کے سامنے ''بے عزتی'' کی ہے تو اس نے اب مجھے حکم دیا ہے کہ تمہارا بہادر کمپنی کمانڈر کل کو چھوڑے ہوئے علاقے پر دوبارہ قبضہ کرے۔ گول والہ ڈر اس وجہ سے رہا تھا کہ عام طور پر کسی کو اگر کسی پوزیشن سے حکماً پسپا کرایا جائے تو اس کو دوبارہ وہاں نہیں بھیجا جاتا۔ اور گول والہ کو ہزار سوچیں آ رہی تھیں کہ معلوم نہیں میرا ردِ عمل کیا ہو گا؟ لیکن میں گول والہ کی بات یا حکم سن کر ہنس پڑا۔ اور کہا کہ ''یہ کام ہمارے بغیر کوئی اور کر بھی نہیں سکتا۔ اور لاہور کو بی آر بی کے آگے رہ کر ہی بچایا جا سکتا ہے۔ اللہ حافظ! میں جا رہا ہوں'' اور میں نے اپنی کمپنی کو پیش قدمی کے احکام دے دیئے۔ گول والہ کہنے لگا تمہیں اور بہت کچھ بتانا ہے کہ میں اور صغیر تمہارے پیچھے پیچھے آ رہے ہیں۔ بکتر بند گاڑیاں بھی تمہاری مدد کے لیے پیچھے سے آ رہی ہیں۔ اور تم ڈوگرئی گاؤں سے آگے مت جانا۔ پہلے اس گاؤں کے بارے تسلی کر و کہ دشمن وہاں نہیں یا دشمن کو وہاں

سے نکالو تو پھر آگے چودھویں میل تک پیش قدمی کرنا وغیرہ۔

105۔ اس عاجز نے گزارش کی کہ ''سب احکام سر آنکھوں پر، میری پیش قدمی میں دیر ہو رہی ہے، میں گھڑی گھڑی کے واقعات سے آپ کو آگاہ رکھوں گا۔ بکتر بند دستے آپ اپنی کمانڈ میں رکھیں اور مجھے جانے دیں''۔ قارئین اس پیش قدمی کے حالات عام فہم نہیں۔ یا تو یہ قدم اور پاؤں میرے نہ تھے جنہوں نے میرے بدن کو اٹھایا ہوا تھا۔ یا یہ قدم اگر میرے تھے تو موجودہ میرا مادی جسم ان قدموں پر نہ تھا۔ وہ کوئی اور روحانی بدن تھا۔ داتا گنج بخشؒ اور ابن عربیؒ نے جو عدم کی کیفیات کی الگ الگ وضاحتیں کی ہیں تو عدم کی وسعتیں پہلی دفعہ سمجھ آئیں۔ اور خودنمائی کے ڈر سے میں پورے مشاہدات اور تجربات نہیں لکھ رہا۔ ڈوگرئی گاؤں پر دشمن کے گولے گر رہے تھے کہ اس نے ہماری طرف پیش قدمی شروع کی ہوئی تھی تو میں نے گول والہ کو بتایا کہ ڈوگرئی میں دشمن نہیں۔ میں نے پیش قدمی جاری رکھی ہوئی تھی۔ فطرت نے فیصلہ کیا ہوا تھا کہ جو چودھویں میل کے علاقے میں پہلے پہنچ جائے گا، وہ یہ لڑائی جیت لے گا۔ اور فطرت نے مجھے وہاں پہلے پہنچا دیا۔ ایک مشین گن کے رونددوں کا ایک باکس رات کی ''بھاگڑ'' میں ادھر ہی رہ گیا تھا وہ بڑا کام آیا۔ نائیک نجیب گل نے پیش قدمی کرنے والے دشمن کے بازوؤں سے ان رونددوں کو استعمال کرتے، دشمنوں کی صفوں کو تہس نہس کر دیا۔ اور دشمن کی ایک پلٹن ہمارے سامنے ڈھیر ہو گئی۔ دوسری پلٹن نے اس کے بائیں بازو سے آگے بڑھنے کی کوشش کی تو کیپٹن صغیر کی کمپنی بھی میدان جنگ میں مورچہ زن ہو چکی تھی۔ انہوں نے اس پلٹن کو تہس نہس کر دیا۔ دشمن بکتر بند گاڑیاں آگے لے آیا۔ تو نائیک غلام محمد نے اپنی

اینٹی بکتر بند توپ کو دشمن کی طرف دوڑا کر نزدیک جا کر دشمن کی دو بکتر بند گاڑیوں کو تباہ کر دیا۔ دشمن زیادہ بکتر بند دستے آگے لایا تو کیپٹن سرور کے بکتر بند دستے ہماری مدد کو پہنچ گئے۔ اور متعدد دشمن کے ٹینکوں کو برباد کر دیا۔ اور دشمن اپنے زخم چاٹنے لگ پڑا۔ البتہ میری تنبیہ کے باوجود کیپٹن سرور اپنی پوزیشن نہ تبدیل کر سکا اور جلد شہادت سے سرفراز ہوا۔

106۔ دراصل 12 ستمبر سے ہر محاذ پر لڑائی میں ''ٹھہراؤ'' آ چکا تھا۔ لاہور محاذ کے بھی برکی کے علاقہ میں کوئی لڑائی نہ ہو رہی تھی۔ قصور محاذ پر دشمن کے پانی چھوڑنے کی وجہ سے ہماری پیش قدمی رک گئی تھی اور ایوب خان دل چھوڑ بیٹھا تھا۔ سیالکوٹ محاذ پر فطرت نے کچھ مومن کی فراست والے افسران اکٹھے کر دیئے اور بھارت کا حملہ ناکام ہو چکا تھا۔ لیکن واہگہ محاذ پر دشمن نے جھوٹ بولا ہوا تھا کہ انہوں نے بی آر بی کو پار کیا ہوا ہے اور وہ شالیمار باغ پہنچنے والے ہیں۔ اس لیے انہوں نے ہمارے خلاف اگلے دس دنوں میں ایک بریگیڈ کے بعد دوسرے بریگیڈ سے خودکشی والے حملے جاری کیے ہوئے تھے کہ بی آر بی تک پہنچ جائیں اور واہگہ محاذ کی اینٹ سے اینٹ بج رہی تھی۔ اصولی طور پر ہماری اس کامیابی اور اس میں ہمارے جانی نقصان کی وجہ سے دو تین دن بعد ہماری جگہ دوسرے دستے آ جانا چاہتے تھے۔ لیکن میں نے جو بریگیڈیئر قیوم کو کھری کھری سنائی تھیں تو میری وجہ سے ہم سب کو وہ ''سزا'' بھی دے رہا تھا۔ اور اس خود کو ایک دن بھی ہمت نہ ہوئی کہ ہمارے دفاع کو دیکھ جاتا جو ننگی جگہ پر بغیر کسی رکاوٹ کے تھا۔ مجھے اپنے کوارٹر ماسٹر حوالدار منصب خان اور رحیم گل نے بتایا تھا کہ وہ ایک گھنٹہ کے لیے وہاں ہمارا کھانا لے کر آتے ہیں تو حیران ہو جاتے ہیں کہ ہم وہاں

دشمن کے لگاتار فائر کے نیچے رہ کر کس طرح گزارا کر رہے ہیں۔ بہرحال گھڑی گھڑی ہمارے مجاہدین شہید ہو رہے تھے۔ کچھ نے پیشنگوئیاں بھی کیں کہ میں نے ان کی ''کہانیاں'' لکھنا ہیں اور کچھ اعلان کرتے تھے کہ میجر صاحب، حضور پاک صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی حفاظت میں ہیں، اوران کو گولی نہیں لگ سکتی۔ بہرحال عجیب صورتِ حال تھی۔ واہگہ محاذ پر دشمن اور ہماری توپوں کا ہر گولہ ہمارے سروں سے گزر کر کہیں جا گرتا تھا اور دشمن ہم پر بمباری کی بوچھاڑ میں مصروف رہتا تھا۔ یا دن کو دشمن کے ہوائی جہاز ہم پر جھپٹتے رہتے تھے۔ لیکن جب دشمن کی پیدل فوج اور بکتر بند ہم پر حملہ آور ہوتے تھے تو ہمارے مجاہدین نعرہ تکبیر کی صدا کے بعد دشمن کو بھون کر رکھ دیتے تھے۔ اور کئی دفعہ یہ عاجز ''عدم'' میں چلا جاتا تھا۔ اور مجھے عجیب و غریب پیغام ملتے تھے کہ ''اے سپاہی تم بڑی غلط فہمیوں کا شکار تھے، کہ بھارت کے ساتھ لڑائی شروع ہوگئی، تو تم دہلی سے ادھر نہ رکو گے۔ کیا ایسے سہرے تمہارے ایوب اور موسیٰ جیسے رہنماؤں کو بندھ سکتے ہیں؟ یہ منافق مومن کی فراست سے عاری ہیں؟ کیا تمہاری فوج اسلامی فوج ہے؟ تمہارے ہیچ یحییٰ اور حمید قسم کے لوگ جنرل بنے ہوئے ہیں۔ تم ان کی بے حیائی والی زندگی راولپنڈی کلب میں اپنی آنکھوں سے دیکھ چکے ہو۔ تمہاری فوج میں کام جھوٹی رپورٹوں پر چلتا ہے۔ کشمیر 48-1947ء کے جہاد کے زمانے میں کیا کیا غداریاں اور کوتاہیاں ہوئیں؟ تمہیں سب معلوم ہے یہ تو رب سبحانہٗ کی مہربانی ہے کہ تمہارے اندر اور خاص کر فوج میں کچھ مخلص لوگ موجود ہیں۔ تو اللہ تعالیٰ نے تمہاری عزت رکھ لی۔ لیکن تمہارے اندر اتنے جھوٹے لوگ ہیں۔ جس کا شمار نہیں۔ تم ہندوستان کو فتح کر کے

وہاں کے لوگوں کو کیا دو گے؟'' اور قارئین ایسی واردات بے شمار ہیں کہ ملک فتح کرنے کے زمانے گزر گئے۔ اب لوگوں کے دل فتح کرنے والوں کی ضرورت ہے۔

107۔ بہرحال گھمسان کی جنگ جاری تھی کہ 18 ستمبر کو میری جگہ میجر فرید پہنچ گیا۔ اور مجھ سے کمپنی کی کمانڈ سنبھال لی۔ اور اوپر والوں کا یہ پیغام لایا کہ جنگ کے دوران میجر فرید نے پوسٹنگ کا حکم مان لیا ہے، تو میجر امیر افضل مردان کیوں نہیں جاتا۔ تو کرنل گول والہ کہنے لگا کہ ''میں پیچھے جا کر اوپر والوں کو سمجھاؤں کہ ہمارا ایک میجر شہید ہو گیا ہے اور دوسرا زخمی اس گھمسان کی جنگ میں امیر افضل اپنے رفقاء سے کیسے الگ ہو سکتا ہے۔'' تو مجھے اس دفعہ گول والہ کے ساتھ ''سختی'' کرنا پڑی اور میں نے کہا کہ ''اگر تمہیں میری ضرورت ہے، تو یہ کام تم کو خود کرنا ہوگا۔'' اور کمانڈ مجھے سونپ کر وہ خود بر گیڈ ہیڈ کوارٹر تک گیا۔ اور نہ صرف میری ''اہمیت'' کے بارے اوپر والوں کی تسلی کی بلکہ محاذ کی بھیانک صورت حال بھی ان پر واضح کی۔ دشمن کو ہمارے ایک جوان کو قید میں لے لینے کی وجہ سے معلوم ہو چکا تھا کہ ہم صرف دو کمپنیاں ہیں۔ اور ہمیں گھیرے میں لینے کے لیے اس نے آہستہ آہستہ آگے بڑھنا شروع کیا ہوا تھا۔ تو 19 ستمبر کو دوپہر کے وقت میجر فرید نے گول والہ کو صاف کہہ دیا کہ کچھ تازہ دم دستے ہمارے دائیں اور بائیں طرف آئیں اور ہم پر سے دشمن کا ''دباؤ'' کم کریں۔ ورنہ ہم اس پوزیشن میں مزید لڑائی نہیں لڑ سکتے کہ نفری کم ہو گئی ہے۔ اور ہماری جگہ اب کوئی اور دستے آ جائیں۔ گول والہ نے کہا کہ یہی کچھ وہ اوپر والوں کو کل بتا آیا ہے۔

108۔ دشمن اب نزدیک سے ہماری پوزیشنوں کی صورت حال بھانپ چکا تھا۔

اس نے ڈائریکٹ فائر سے ہمارے توپخانہ کے ساتھ ملاپ والی دونوں سیٹوں کو Knock out کر دیا۔ اور سورج غروب ہونے کے جلدی بعد ہم پر حملہ کے لیے بمباری شروع کر دی۔ اور آہستہ آہستہ زمین حاصل کرنا شروع کر دی۔ میں Spare تھا اس لیے آہستہ سے پیچھے نکل گیا کہ ہمارے پیچھے جو 18 بلوچ کے کیپٹن خورشید کے ساتھ توپخانہ کا میجر ضیاء الدین اوپل جو اوپی کا کام کرتا ہے اس سے دشمن پر فائر کرواتا ہوں کہ مجھے ٹارگٹ نمبر زبانی یاد تھے۔ وہاں میرے پہنچنے سے چند منٹ پہلے میجر اوپل اور کیپٹن خورشید سخت بمباری سے دونوں شہید ہو چکے تھے۔ اور ان کے جسد پیچھے بھیجنے کا بندوبست ہو رہا تھا۔ تو میں ''مایوس'' ہو کر کرنل گول والہ کے ہیڈ کوارٹر واپس پہنچا۔ لیکن کسی کو ان شہادتوں کے بارے نہ بتایا۔ کوئی چند لمحے ہی گزرے ہوں گے کہ سامنے سے میجر فرید کی آواز آئی کہ چند اور زخمیوں کے ساتھ وہ بھی زخمی ہو کر جیپ میں پیچھے جا رہے ہیں اس سلسلہ میں بعد میں کافی لے دے ہوئی کہ زخم کتنا تھا یا گول والہ سے اجازت لینا تھی۔ بہر حال ہمارے لیے مسئلہ پاکستان کا دفاع اور لاہور کو بچانا تھا کہ اگر ایک کمپنی کے آگے والے محاذ سے قدم اکھڑ جائیں، تو پیچھے والے ایسے سر پر پاؤں رکھ کر بھاگتے ہیں کہ دوسری جنگ عظیم میں بنگال برہما کے علاقہ ارکان سے جو بھاگے تھے تو وہ وزیر آباد ریلوے سٹیشن پر آ کر رکے کہ ان کو وہاں ''یاد'' آیا کہ ان کے سنٹر سیالکوٹ کو گاڑی وزیر آباد سے جاتی ہے۔ ربّ سبحانہٗ ''بھاگڑا'' سے بچائیں۔

109۔ چنانچہ میں نے گول والہ کو کہا کہ افسر کے بغیر A کمپنی وہاں نہ ٹھہر سکے گی اس لیے میں کمانڈ سنبھالنے آگے جا رہا ہوں۔ گول والہ کہنے لگا اکیلے وہاں

کیسے پہنچو گے؟ عرض کی میرے ساتھ کون جائے گا؟ لیفٹیننٹ (بعد میں کرنل) افتخار کہنے لگا کہ وہ تیار ہے لیکن جگہ سے واقف نہیں اور ساری زندگی افسوس رہے گا کہ پیچھے پیچھے تھا میں نے کہا کوئی بات نہیں اس وقت کی ''رفاقت اور ساتھ'' ہونے کی وقعت ایک سنگ میل بن جائے گی۔ جب ہم پوزیشن میں پہنچ جائیں تو بڑھاپے کی وجہ سے میرا سانس تو نارمل نہ ہوگا تم ایک زوردار نعرہ تکبیر لگا دینا۔ عسکری تاریخ کے طالب علموں کو معلوم ہے کہ اندھیری رات میں حملہ ہونے والی جگہ کی کمانڈ کبھی مشکل سے جا کر سنبھالی جاتی ہے کہ معلوم نہیں ہوتا کہ اپنے لوگ پوزیشن میں ہوں گے یا دشمن وہاں پر قابض ہونے والا ہوگا یا ہو چکا ہوگا۔ بہر حال ہماری اپنے رب پر توکّل پوری ہوئی اور افتخار نے نعرہ تکبیر کے علاوہ میرے پوزیشن میں پہنچ جانے کا اعلان بھی کر دیا۔ تو صوبیدار چنار گل نے پشتو اور پنجابی ملی جلی زبان میں نعرہ لگا دیا۔ ''مجاہدو تکڑے ہورب سجانہ' نے میجر امیر افضل کو پھر تمہاری رہنمائی کے لیے بھیج دیا ہے۔'' جوان کہنے لگے دشمن پر ہماری توپیں فائر کیوں نہیں کرتیں۔ اب ان کو کیسے بتاتے کہ ملاپ نہیں۔ حکم دیا۔ اندازاً اینٹی بکتر بند توپ کے گولے دشمن پر داغ دو۔ سویرے تک مزید بارود منگوا لیں گے۔ چنانچہ اس فائر سے جو روشنی ہوئی تو معلوم ہوا کہ دشمن ہمارے سامنے سو گز تک پہنچ گیا ہے۔ جس کو ہمارے بازو والے مشین گنوں اور دائیں سے کیپٹن صغیر کے مشین گن والوں نے کراس فائر کر کے بھون کر رکھ دیا۔ اور دشمن کا حملہ پسپا ہو گیا۔ لیکن دشمن نے اب ہمارے سامنے بہت نزدیکی حاصل کر لی تھی۔ اور 20، 21 ستمبر کو دشمن نے میرے بائیں بازو سے آگے کی طرف کافی پیش قدمی کر لی۔ اور میرے پیچھے ڈوگرئی گاؤں

میں ہماری چند بکتر بند گاڑیاں دور سے فائر کر کے دشمن کو روکے ہوئے تھیں۔ کہ میرے فائر کی زد سے دشمن باہر تھا۔ یہ بڑی خطرناک صورت حال تھی۔ کہ 21 ستمبر کو سورج غروب ہونے سے تھوڑا پہلے ہم نے دیکھا کہ میجر وحید قادر کے ماتحت ہماری یہ بکتر بند گاڑیاں، ڈوگرئی کے علاقہ کو خالی کر کے کہیں پیچھے جا رہی تھیں۔ اب پیچھے والوں کو ایسی صورت حال وائرلیس پر تو بتائی نہ جا سکتی تھی۔ اس لیے کرنل گول والہ نے لیفٹیننٹ افتخار کو بھیج کر برگیڈیئر قیوم شیر پر واضح کیا کہ بکتر بند گاڑیوں کو وہاں روکا جائے یا ہماری پچھلی طرف کوئی امداد بھیجی جائے۔ ورنہ ہم دشمن کے گھیرے میں آ جائیں گے۔ قیوم شیر نے کہا کہ فائر بندی ہونے والی ہے۔ وہ کچھ نہیں کر سکتا۔ افتخار نے اسے بہت سمجھایا کہ دشمن ہر قیمت پر بی آر بی کو پار کرنا چاہتا ہے۔ اور ہمیں گھیرے میں لے کر تہس نہس یا قید کرنا چاہتا ہے۔ قیوم شیر نے کہا کہ دشمن اتنا پاگل نہیں کہ آخری وقت اپنا اتنا جانی نقصان کرائے۔ تم لوگ خواہ مخواہ گھبرا رہے ہو۔

110۔ افتخار ہمیں یہ ٹکا سا جواب دینے کے لیے پیچھے مڑا۔ تو دشمن کی نویں جاٹ پلٹن ہمارے بکتر بند دستوں کے چلے جانے کا فائدہ اٹھا کر ڈوگرئی گاؤں پر قابض ہو چکی تھی۔ اور ہمیں گھیرا پڑ چکا تھا۔ اور افتخار ہم تک نہ پہنچ سکا۔ تو وہ ''بے خبر قیوم شیر'' کو بتانے اس کے ہیڈ کوارٹر چلا گیا اور اس پر واضح کیا کہ دو کمپنیوں کو گھیرا پڑ چکا ہے۔ بلکہ فائر کی آوازوں سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ کہ دشمن نے سامنے سے بھی حملہ کر دیا ہے۔ قیوم شیر اس وقت بھی بہت کچھ کر سکتا تھا۔ اور چند دستوں سے نویں جاٹ کو الجھا کر قید میں لیا جا سکتا تھا۔ لیکن وہ کہنے لگا کہ وہ رات کے وقت کچھ نہیں کر سکتا۔ ادھر میری

پوزیشن پر سامنے سے بھارت کی پنجاب رجمنٹ اور صغیر کی پوزیشن پر ڈوگرہ رجمنٹ نے حملہ کر دیا اور یہ حملے ہم نے زیادہ تر دشمن پر گرنیڈ پھینک کر پسپا کیے۔ اور گو ہماری آدھی نفری شہادت حاصل کر چکی تھی اور ہم کسی شہید کو دفن بھی نہ کر سکے لیکن 22 ستمبر کو جب روشنی ہوئی تو ہم حیران ہوئے کہ دشمن کی پیدل فوج ہم سے تقریباً دو سو گز دور مورچہ زن تھی۔ اور ہم اپنے دفاع پر قائم تھے۔ قیوم شیر اور اوپر والے اگر صبح پہلی روشنی کے جلد بعد کوئی کاروائی کر لیتے تو بھارت کی پلٹن نویں جاٹ کو قید میں لیا جا سکتا تھا۔ اور ہماری کچھ مدد کر لیتے تو ہم دشمن کو آگے نہ بڑھنے دیتے لیکن ہمارا بکتر بند شکن بارود ختم ہو چکا تھا۔ تو دشمن دس بجے کے قریب جو ٹینکس ہمارے سامنے لے آیا۔ ان کو جلد ہماری اس ''کمزوری'' سے آگاہی ہوگئی۔ اور دشمن کی بکتر بند گاڑیوں نے میرے پوزیشن اور کیپٹن صغیر کی کمپنی کے صوبیدار حکیم کے پوزیشن کو روند ڈالا۔ لیکن چھوٹے ہتھیاروں کی مدد سے ہم نے دشمن کی پیدل فوجوں کو روکا ہوا تھا۔ لیکن کب تلک؟ میرے دل سے پکار نکل گئی۔ ''اے میرے رب کیا کوئی ایسی گولی نہ بنی تھی کہ مجھے ٹھنڈا کر دیتی۔ اب کافر کی قید کی ذلت سے دوچار ہونا پڑے گا۔'' تو گول والہ کا آخری پیغام ملا۔ ''کسی منظّم پسپائی کا وقت کل رات سے ختم ہو چکا تھا، جب ہمیں گھیرا پڑ گیا تھا۔ وہ اور کیپٹن صغیر گھیرا سے باہر نکلنے کی سعی کر رہے ہیں۔ تمہارا کوئی مجاہد بچ گیا ہے تو اکا دکا ہو کر بی آر بی پر پہنچنے کی کوشش کرو۔'' آگے کیا ہوا پس فطرت نے رہنمائی کی کہ بعد دوپہر کسی وقت لڑتے بھڑتے یہ عاجز اور صغیر کی کمپنی کا صوبیدار رستم، تین چار مجاہدین کے ساتھ گھیرا توڑ کر بی آر بی پر پہنچ گئے۔ اور ہم سے چند سو گز دور ایک گھمسان کی ہاتھوں ہاتھ

جنگ جو ہمیں نظر آئی، اس کے بارے معلوم ہوا کہ وہ قیوم شیر کی غلط وقت پر غلط جگہ کاروائی تھی جہاں بلوچ پلٹن کے کیپٹن آفریدی اوراس کے متعدد جوان شہادت سے سرفراز ہونے کے بعد بھی کچھ حاصل نہ ہوسکا۔ اوراس مڈھ بھیڑ میں کرنل گول والہ زخمی ہوکر دشمن کا قیدی ہوااور کیپٹن صغیر بھی شہید ہوگیا۔ البتہ کچھ اکیلے جوان گھیرے سے نکل گئے تھے۔

111۔ اب میں کہانی کو مختصر کرتا ہوں کہ چند گھنٹے بعد فائر بندی ہوگئی۔ 23 ستمبر صبح روشنی ہوتے بھارتیوں سے رابطہ کے بعد ہم نے جس طرح اپنے شہدا کو میدان جنگ سے اٹھایا اس کا سرسری ذکر پیرا76 اور 77 میں ہو چکا ہے۔ کوئی سینکڑہ بھر شہدا کو ہم تلاش کر سکے۔ 22 شہدا کے جسد کا کوئی حصہ یا نشانی ہمیں نہ مل سکی کہ علاقے کی اینٹ سے اینٹ بج گئی تھی اور بھارتی بھی کوئی سات آٹھ سو آدمیوں یا مردوں کی لاتوں میں رسی باندھ کران کو گھسیٹ کر اپنے قبضہ شدہ علاقے میں لے جارہے تھے۔ اس آخری حملہ سے پہلے بھی ہمارے شہدااور زخمیوں کی تعداد سینکڑہ سے تجاوز کرگئی تھی۔ اور حیرانگی کی بات ہے کہ ہمارا کوئی اوپر والا فائر بندی کے بعد بھی ہماری "پرسان حالی" کے لیے نہ پہنچا۔ اور ساتھ گیارہویں ڈویژن کے جی ون کرنل (بعد میں جنرل) بی ایم مصطفیٰ ایک ہیلی کاپٹر پرسوار میرے پاس پہنچ گئے، کہ گول والہ سے پہلے وہی ہمارے کمانڈر تھے۔ ان کو میں نے ساری صورت حال سے آگاہ کیا کہ تقریباً ساڑھے تین سونفری سے کوئی پچاس آدمی زندہ بچ سکے ہیں۔ جن میں سے اکثر میری طرح معمولی زخمی تھے کہ شہیدوں کے خون سے سینچ ہونے والی زمین پر ہمیں بھی چند خون کے قطرے گرانے کی سعادت مل گئی ہے۔ چالیس، پچاس زیادہ زخمی یا گھیرا کو

نہ توڑ سکنے کی وجہ سے دشمن کی قید میں جا چکے ہیں۔ اور اوپر والوں کی کوتاہیاں کھل کر بیان کیں۔ تو وہ وہاں سے سیدھا جنرل سرفراز کے پاس پہنچا۔ اور اس کو سب کہانی سنا دی۔ میں پلٹن کے بی ایچ لان میں پہنچا، تو خبر ملی کہ دوسرے دن جنرل سرفراز ہمارے پاس معذرت کے لیے آ رہا ہے۔ لیکن ساتھ ہی بریگیڈیئر قیوم شیر نے مجھے اپنے ہیڈ کوارٹر میں بُلا بھیجا تو میں سمجھا وہ بھی معذرت کرے گا یا دلجوئی کرے گا۔

112۔ لیکن میری حیرانگی کی کوئی حد نہ رہی کہ قیوم شیر نے ''ایکٹنگ'' کرنا شروع کی ہوئی ہے اور مجھے ''مرعوب'' کرنے کے لیے اونچی آواز میں کہہ رہا ہے کہ میرے سامنے کسی کی غلطی آ گئی تو میں اس کو شوٹ کر دوں گا۔ میں نے دل میں سوچا کہ لڑائی کے دوران تو یہ آدمی مورچے سے باہر نہ نکلتا تھا یہ مجھے مرعوب کرنے کے لیے اب شیخیاں بگھار رہا ہے۔ تو میں نے اس کو روایتی سلام کے بعد کہا کہ جو عظیم قربانی ہم نے دی ہے تو اس کو ہمارے پاس آنا چاہیے تھا۔ اور میں جو کمک آ جانے کی وجہ سے پلٹن کو نئے سرے سے منظّم کر رہا ہوں میرے کام میں مخل نہ ہونا تھا۔ تو کہنے لگا کہ جو کچھ ہوا ہے وہ اس کی چھان بین میں سخت مصروف ہے۔ خبردار کہ میں کسی کو بتاؤں کہ کیا ہوا ہے۔ میں تمہیں آج رات یا کل سویرے تک ہدایات دے دوں گا کہ کیا کچھ قوم کو یا اوپر والوں کا بتایا جا سکتا ہے۔ میں نے کہا ''بریگیڈیئر صاحب میں ذرا وکھری قسم کا انسان ہوں''۔ بریگیڈ کمانڈر کے طور پر تمہارے اوپر فرض تھا کہ ہر دوسرے دن ہمارے حالات کو آ کر خود دیکھتے تمہیں اتنی توفیق نہ ہوئی کہ کسی ایک دن دور سے ہی میری پوزیشن پر نظر ڈال لیتے۔ تم کون ہوتے ہو چھان بین کرنے والے؟ لڑائی کی وجہ سے ہم نے تمہارے

احکام یا رویہ پر اعتراض نہ کیا۔ اب میں تمہیں اپنا برگیڈ کمانڈر تسلیم کرنے کے لیے تیار نہیں۔ اور اوپر والوں کے ساتھ رابطہ کے لیے واپس اپنے ہیڈ کوارٹر میں جا رہا ہوں۔ اور وہاں سے چل پڑا۔ جہاں سے ڈویژن ہیڈکوارٹر کو صورت حال سے آگاہ کیا۔

113۔ دوسرے دن کیا دیکھتا ہوں کہ برگیڈیئر قیوم شیر کی جیپ آ کر میرے مرکز کے باہر رکی، تو ایکٹنگ کرنے کی میری باری تھی۔ میں نے پستول ہاتھ میں لیا۔ اور دور سے پکارا کہ "قیوم شیر تم یہاں سے چلے جاؤ ورنہ میرے جذبات مجھے کوئی Extreme کاروائی کرنے پر مجبور کر دیں گے۔" اور وہ کھسک گیا۔ تھوڑی دیر کے بعد کیا دیکھتا ہوں کہ میجر غلام حسن (بعد میں جنرل) جو عمر میں مجھ سے چھوٹا اور عہدہ میں سینئر تھا، جھک کر مجھ سے لپٹ چکا تھا۔ اور کہنے لگا کہ "لالہ آپ نے اپنی روایت کو عملی جامہ پہنا دیا اور قرون اولیٰ کے مجاہدین والا کردار اپنا کر جو روایات قائم کی ہیں اور پلٹن کے نامؐ کو جو بلندی دلوائی ہے کہ بھارتی میڈیا بھی دو کمپنیوں کو پاکستان کی ایک کریک بٹالین کا نام دے چکا ہے۔ ہمیں اس پر فخر ہے۔ اب سرکاری طور پر اس پلٹن کی کمانڈ مجھے دے دی گئی ہے۔ لیکن پلٹن کے روحانی سربراہ آپ ہی رہیں گے۔ اور آپ پلٹن کی دوبارہ تنظیم میں میرا ہاتھ بٹائیں۔ جنرل سرفراز اور اس کے سٹاف معذرت کے لیے اور آپ بچے ہوئے مجاہدین کو خراج تحسین پیش کرنے کے لیے آ رہے ہیں۔ وہ ہمارے مہمان ہوں گے۔ تو ہمیں ان کی عزت کرنا چاہیے۔" میں نے میجر حسن کو کہا کہ میرا ارادہ جنرل سرفراز کو بھی کھری کھری باتیں سنانے کا تھا، اب تمہاری عزت کا معاملہ ہے، شاید جنرل سرفراز کو دیکھ کر میں اپنے جذبات پر کنٹرول نہ کر

سکوں۔ اس لیے میں الگ ہو رہا ہوں اور آپ جنرل سرفراز کو بتا دیں کہ امیر افضل کی ذہنی حالت ایسی ہے کہ ابھی وہ کسی کو نہیں ملنا چاہتا۔ یہ تو بہت بعد میں معلوم ہوا کہ ڈویژن والوں نے ہیلی کاپٹر بھیج کر میجر حسن کو اپنے پاس بلایا اور جنرل سرفراز نے اس کو ''ٹاسک'' دیا کہ وہ کسی طرح سے امیر افضل کو ''کنٹرول'' کرے تو حسن کو بھی بہادری کے تمغہ سے نواز دیا جائے گا۔ حالانکہ جہاں پر وہ تعین تھا وہاں ایک گولی بھی نہ چلی تھی کہ بھارتی وہاں سے بہت دور تھے اور انہوں نے ادھر کا رخ ہی نہ کیا تھا۔ میجر حسن خوش ہو گیا۔ کہ چلو میجر امیر افضل نے ''چپ'' تو سادھ لی ہے۔

114۔ جنرل سرفراز جب آیا تو میجر حسن نے اس کو حالات سے آگاہ کیا۔ اور بچے ہوئے مجاہدین کو سرفراز نے خراج تحسین پیش کیا۔ لیفٹیننٹ افتخار اور صوبیدار رستم نے پہلے تو کچھ مختصر حالات بتلائے کہ بریگیڈ والوں نے بروقت ہماری مدد نہ کی لیکن بریگیڈیئر قیوم شیر کو وہاں کھڑے دیکھ کر افتخار اپنے ''جذبات'' کو کنٹرول نہ کر سکا۔ اور بریگیڈیئر قیوم شیر کو مخاطب کر کے سب لوگوں کے سامنے اس کا کچا چٹھا اس طرح کھولا کہ سب حیران ہو گئے۔ اور جب ہماری عظیم قربانی کا ذکر کیا کہ صرف پچاس کے قریب زندہ ہیں اور اگر بریگیڈیئر قیوم شیر بروقت کاروائی کرتا تو یہ قربانی نہ دینا پڑتی اور بھارتی جاٹ پلٹن ہماری قید میں ہوتی۔ سرفراز اور اس کے سٹاف والے حیران تھے کہ ساری جنگ میں قیوم شیر نے ان کو اندھیرے میں رکھا۔ اور سب کامیابیوں کے سہرے وہ اپنے سر باندھتا رہا۔ وہ اس کی بہادری کے تمغہ کے لیے بھی سفارش کر چکے تھے۔ جس کو بعد میں روکنے کی کوشش کی لیکن اعلان ہو گیا تھا اور رکاوٹ نہ پیدا کی جا سکی۔ البتہ قیوم شیر کو اوپر کی

ترقی کیلئے Unfit قرار دے دیا گیا۔ البتہ جنرل سرفراز اور اس کے سٹاف والے بھی تذبذب میں تھے کہ وہ بھی بری طرح سے ناکام ہوئے تھے۔ ان کی بھی ذمہ داریاں تھیں۔ اور لاہور محاذ کی جنگ اس بری طرح لڑی گئی تھی کہ ثبوتوں کے ساتھ میرے پاس اتنا مواد موجود ہے، کہ میں یہ شائع کر دوں تو ہر عام فوجی ذہن والا افسر میرے ساتھ اتفاق کرے گا کہ جنرل سرفراز، تین برگیڈیئر، تین سینئر سٹاف افسران اور متعدد برگیڈوں کے سٹاف افسران کا کورٹ مارشل کیا جا سکتا تھا۔ اس لیے وہ جانتے تھے کہ واہگہ محاذ کی لڑائی کی بہت باتوں پر پردہ رکھا جائے۔ اور لوگوں کی توجہ ہٹانے کے لیے برکی محاذ پر میجر عزیز بھٹی کو نشان حیدر دلوادیا۔ جس کے لیے اس کے پلٹن کے کمانڈر کرنل ابراہیم قریشی نے ستارہ جرأت کی سفارش کی تھی۔ حالانکہ عزیز بھٹی کا دشمن کے ساتھ کبھی سیدھے طور پر آمنا سامنا نہ ہوا تھا۔ کہ برکی سے ہماری سرحد بہت دور ہے۔ عزیز بھٹی بی آر بی کے پیچھے ہی رہا اور دشمن 9 تا 10 ستمبر کو بی آر بی کے نزدیک پہنچا اور بی آر بی کے آگے 12 پنجاب کا مشہور کھلاڑی اور ایک میل کا ریکارڈ ہولڈر نائب صوبیدار زیب دین 15 ستمبر کو لڑائی لڑتا شہید ہوا تھا۔ عزیز بھٹی کو 11 ستمبر کو ہوائی جہاز کی گولی لگی تو وہ مر گیا اور چونکہ وہ پاکستانی فوج کا مشہور افسر تھا کہ کیڈٹ کے طور پر اعزازی تلوار حاصل کر چکا تھا تو اس کے لیے ستارہ جرأت کی سفارش ہوگئی۔

115۔ اب اعزازی تلوار کی کہانی بھی عجیب وغریب ہے کہ یہ تلوار (بعد میں نواب کالاباغ کے مشہور ملٹری سیکرٹری کرنل) ملک شریف کو مل رہی تھی۔ تو کہتے ہیں کہ عزیز بھٹی کا خاندان چھپا قادیانی ہے۔ اور یہ اعزازی تلوار مشہور

قادیانی جنرل اختر ملک نے آخری وقت عزیز بھٹی کو دلوادی، جو اس زمانے میں وہاں کرنل تھا۔ اور یہ بھی کہا جاتا ہے کہ جنرل سرفراز کی دوسری بیوی جو ایک نرس تھی اس کا تعلق بھی قادیانی خاندان سے ہے۔ اس لیے ڈویژن والوں نے ابراہیم قریشی کو کہا کہ عزیز بھٹی کی سفارش ستارہ جرأت کی بجائے نشان حیدر کی کریں جس کے لیے تین چشم دید گواہوں کے بیانات ثبوتوں کے ساتھ پیش کیے جانے تھے، تو چشم دید گواہ ایک اکیلا توپخانہ کا صوبیدار تھا جو اوپی کا کام کر رہا تھا۔ جس نے عزیز بھٹی کی کسی بہادری کا بیان دینے سے انکار کر دیا۔ اور جنرل سوار خان سمیت جو اس زمانے میں کرنل تھا، توپخانے کے اکثر اہم افسران جانتے ہیں کہ اس صوبیدار کو بعد میں بھی کتنا تنگ کیا گیا۔ کہ اس کے ہمدرد افسروں نے اس کو ان تنگیوں سے بچایا۔ بہر حال کس کس سے جھوٹی بہادری کی گواہیاں لیں، کیسے خانہ پوری کی، ایسی باتوں کی چھان بین پر یہ عاجز وقت کیوں ضائع کرے۔ لیکن بعد میں عزیز بھٹی کی بیوی نے دوسری شادی سے پہلے جو ''سیکنڈل'' کیے، یا بیٹوں کے ساتھ بعد میں بھی جھگڑے چلتے رہے تھے۔ تو فطرت کھڑی ہنس رہی ہے کہ غیرتمند اور بہادر خاندانوں میں ایسے ''سیکنڈل'' نہیں ہوتے۔

116۔ لیکن لاہور کے اوپر والوں کا مقصد پورا ہو گیا۔ پوری قوم کے لیے برکی محاذ ''مقدس'' بن گیا۔ حالانکہ واہگہ محاذ کے مقابلہ میں برکی محاذ کی کوئی ''وقعت'' نہ تھی۔ اور لڑائی بھی اتنی معمولی تھی کہ درجن بھر لوگ شہید ہوئے۔ جن میں ایک اور افسر میجر حبیب بھی تھا، جس کی شہادت بھی بی آر بی کے پیچھے ایک توپ کے گولے سے ہوئی۔ اس کے مقابلہ میں واہگہ محاذ کی

گھمسان کی جنگ میں بی آر بی کے آگے سینکڑوں مجاہدین کوشہادت نصیب ہوئی جن میں گیارہ تو افسران تھے۔ جن میں آٹھ کی شہادت ہاتھوں ہاتھ کی لڑائی میں واقع ہوئی تھی۔ اور نو ایسے تھے جو یا میرے ماتحت تھے یا میری مدد کر رہے تھے۔ تو اس وقت ان کو شہادت نصیب ہوئی۔ یعنی میں ان کی شہادتوں کا چشم دید گواہ ہوں اور سب عظیم شہدا میرے پاس بہت کچھ ''چھوڑ'' گئے۔ کہ شہادت شہدا پر بہت پہلے وارد ہو جاتی ہے۔ کسی پر چند لمحے پہلے اور کسی پر چند دن پہلے، کہ ان کی شخصیتوں میں عظیم تبدیلی پیدا ہو جاتی ہے۔ اور وہ میرے لیے ایسی پیش بینیاں کر گئے ہیں جو پوری ہو رہی ہیں۔ اور کچھ مجھے بتا گئے تھے کہ جنگ کے بعد بھی میری جنگ ''جاری'' رہے گی۔ گو بھارت والوں کا جو ہم نے نقصان کیا تو وہ کچھ معلوم کر کے 21 اپریل 69ء کو بھارتی لوک سبھا میں سناٹا چھا گیا تھا کہ بھارت والوں نے بھی سب باتوں پر پردہ ڈالا ہوا تھا۔ لیکن ہمارے اوپر والوں نے تو حد کر دی کہ نہ ہمارے ان شہدا کے نام پر کسی سڑک کو منسوب ہونے دیا۔ نہ ان کی کوئی یادگار بننے دی۔ سوائے فوجی قبرستان کے ایک شہید گنج کے جہاں تقریباً ستر شہدا اکٹھے مدفون ہیں اور اب بھی ہمارے دانشور جب ستمبر 65ء کی جنگ کا ذکر کرتے ہیں تو لاہور کے دفاع کو عزیز بھٹی کی شخصیت کے ''محور'' کے گرد گھماتے رہتے ہیں۔ جس کے سیدھے طور پر دشمن کے ساتھ آمنا سامنا بھی نہ ہوا۔ اور جنرل سرفراز اور قیوم شیر جیسے لوگوں کو بہادری کے تمغوں سے نواز دیا گیا۔ جون 1994ء اخبار نوائے وقت میں الطاف گوہر لکھتا ہے کہ ایوب کو معلوم ہو گیا تھا کہ ستمبر 65ء کی جنگ میں لوگوں نے بہت جھوٹ بولے۔ ایوب بے چارے کو شاید اپنے جھوٹ

بھول گئے ہوں گے۔ لیکن بات اس سے بھی بڑھ کر ہے۔ جنگ کے دو ماہ بعد اوپر والوں نے احکام دیئے کہ تمام وار ڈائریاں جلا دی جائیں کہ ان کو ڈر تھا کہ ان کے غلط احکام اور غلط اعمال جگہ جگہ یونٹوں کے ریکارڈ میں ہیں۔ لیکن اس حکم پر عمل نہ ہوا۔ لوگوں نے پرائیویٹ طور پر ایسے ریکارڈ اپنے پاس رکھ لئے کہ کبھی کبھی جو سچ اخباروں میں آ جاتا ہے وہ ان پرائیویٹ ریکارڈوں سے ہوتا ہے۔

117۔ ہر محاذ کی کہانی لاہور محاذ کی طرح ''ملی جلی'' ہے۔ قصور محاذ کے جنرل نصیر اور اس کے دونوں برگیڈیرز، بشیر اور لمب بالکل نا اہل اور کوتاہ ثابت ہوئے۔ اور بکتر بند دستوں کی مدد کے لیے پیدل فوج تو نہ ہونے کے برابر تھی اور پھر نالائقی اتنی بڑی تھی کہ اتنی بڑی مہم کے لیے روھیوال نالہ پر صرف ایک پل تھا، جس کے ساتھ میجر دوست محمد کا ٹینک ٹکرا گیا اور میجر صاحب بھی شہید ہوئے اور پل ناکارہ ہو گیا۔ برگیڈ کمانڈر کی نالائقی کہ وہ پل ہی ٹھیک نہ کرا سکا اور اسلام کے عظیم فرزند کرنل صاحبزادگل فاتح کھیم کرن کو پیچھے آنا پڑا اور خود پل ٹھیک کرایا اور دوسری پیش قدمی میں وہ خود شہید ہو گیا۔ تو بھارت کو موقع مل گیا انہوں نے میدان جنگ میں پانی چھوڑ کر میدان کو دلدل بنا دیا۔ جس کا ذکر اکثر کتابوں میں ملتا ہے کہ یہ دیکھ کر ایوب ''دل چھوڑ'' گیا۔ اگر پیدل فوج وافر تعداد میں ہوتی تو کچھ عرصہ کے لیے ہراول کا کام وہ کرتے اور دلدل سے نکلنے کے بعد بکتر بند دستے پھر آگے ہو جاتے۔ اس کوتاہی پر ہم پہلے بھی بہت رونا رو چکے ہیں۔ لیکن علاج موجود تھا۔ جنرل عبدالمجید برہمی کے گیارہویں ڈویژن کے پیدل دستوں کے سامنے سے دشمن فرار ہو گیا تھا۔ اگر حمید کوشش کرتا کہ اس کے دستے بازو سے ساری

صورت حال دیکھ رہے تھے تو وہ لوگ دلدلی علاقوں کی ذمہ داری سنبھال لیتے اور بکتر بند دستوں کو حفاظت دے کر پھر پیش قدمی کے لیے پھیلاؤ دیا جا سکتا تھا۔ یہ پہلو نہ کسی نے جنگ سے پہلے سوچا اور نہ حالات کا فائدہ اٹھایا، کہ بعد میں لاہور کے پیدل دستے بھی مددگار بن سکتے تھے۔ کہ راقم از خود ہراول دستوں کے ساتھ واہگہ پہنچ گیا تھا۔ دشمن سر پر پاؤں رکھ کر اٹاری کی طرف بھاگ رہا تھا۔ جنرل چوہدری نے بیاس دریا کے پیچھے تک پسپائی کے احکام دے دیئے تھے۔ لیکن ہمارے بکتر بند دستے رک گئے۔ ایوب جنرل حمید برہمی سے کچھ ناراض بھی ہوا، لیکن وقت گزر چکا تھا۔ ہمیں بھی واہگہ سے پسپا کر دیا گیا۔ اور بھارتی دستے واپس آنے شروع ہو گئے۔ اور بھارتیوں کا بڑا حملہ سیالکوٹ محاذ پر شروع ہو گیا۔

118۔ سیالکوٹ محاذ کے ڈویژن کمانڈر اسمٰعیل اور بکتر بند دستوں کے لیے ''مشیر'' بریگیڈیئر آفندی کے حملے کے فوراً بعد ان کی ''کم دلی'' کی وجہ سے ان کے عہدوں سے برخاست کرنا یا ہٹانا پڑا۔ لیکن فطرت ہمیں شکست سے ہر جگہ بچا رہی تھی، کہ جیسے اس عاجز کو اشارہ ہوا تھا کہ ہر جگہ اچھے آدمی موجود ہیں، تو کچھ غیرتمند اور بہادر آدمی سیالکوٹ محاذ پر بھی اکٹھے ہو گئے جن میں جنرل ٹکا خان، جنرل ابرار، پنجاب رجمنٹ کے کرنل بعد میں جنرل جمشید بلوچ رجمنٹ کے کرنل بعد میں بریگیڈیئر شنواری، فرنٹیئر فورس کے کرنل صدیق فقیر بکتر بند دستوں کے کرنل بعد میں بریگیڈیئر نثار، توپخانہ کے کرنل اور بعد میں بریگیڈیئر عطا محمد کو شامل کیا جا سکتا ہے۔ اور جونیئر افسران میں تو بکتر بند دستوں کے میجر عباسی اور بلوچ رجمنٹ کے میجر نسیم رضوی سمیت ایک انبوہ تھا۔ تو ہم نے دشمن کے حملہ کو چونڈہ کے

پاس روک لیا۔ پھر قصور محاذ سے نصیر کو ہٹا کر صاحبزادہ یعقوب کے ماتحت بکتر بند دستوں کی اکثریت سیالکوٹ پہنچ گئی۔ اور ہم اس قابل ہو گئے تھے کہ سیالکوٹ محاذ پر بھارت کے بکتر بند دستوں کو تہس نہس کر کے جموں، پٹھانکوٹ سڑک پر قبضہ کر لیں، کہ پیدل دستے جو سنٹروں میں کھڑے کئے گئے تھے، وہ محاذ پر پہنچنے شروع ہو گئے تھے۔ لیکن صاحبزادہ یعقوب کی کم دلی اور ایوب کے دل چھوڑنے اور "بارود کی کمی" کے بہانے نے جنگ کا پانسہ تبدیل کرنے کا ایک اور سنہری موقع ہم سے گنوا دیا۔ کہ فطرت ہمارے منافق رہنماؤں کو کوئی سہرا باندھنے کے لیے "تیار" نہ تھی۔ اس جنگ سے ہم نے کچھ بھی "حاصل" نہ کیا۔ البتہ بھارت والے ہمیں شکست نہ دے سکے۔ لیکن انہوں نے کچھ بھی نہ "کھویا"۔ ہمارے تو سیالکوٹ اور لاہور کے وسیع علاقے ایک دفعہ تو بھارت کے پاس چلے گئے تھے۔ مقابلتاً ہم نے کھیم کرن اور چھمب جوڑیاں کے چند مربع میل علاقے حاصل کئے۔

119۔ کچھ مجاہدین نے بے مثال بہادری کا مظاہرہ کیا۔ لیکن غداریوں اور کوتاہیوں کا بھی حساب نہیں۔ ہم حیران ہیں کہ ہمارے رہنماؤں نے قوم کو بے وقوف بنا کر اس جنگ کو ہماری فتح کے طور پر کیسے پیش کر لیا۔ اور آج تک قوم کی اکثریت کا خیال ہے کہ یہ ہماری فتح ہے۔ اور جو کچھ یہ عاجز اپنے مضامین میں نوائے وقت میں تفصیل سے لکھ چکا ہے، اور یہاں اختصار سے لکھ دیا ہے، ایسی تحقیق کسی ایک کتاب میں بھی نہ ملے گی۔ تو تاشقند کے معاہدہ کے طور پر ہم نے کچھ حاصل نہ کیا، اور نہ کچھ حاصل کر سکتے تھے کہ ہم نے غلط وقت پر جنگ بند کی۔ جموں، کٹھوعہ روڈ پر قبضہ کے بعد فائر بندی کرتے، تو تاشقند میں بہت کچھ حاصل کر سکتے تھے۔ لیکن اب

بھٹو نے تاشقند کے ''شوشہ'' سے قوم کو بے وقوف بنانا شروع کر دیا۔ کہ ہم نے میدان جنگ میں جو کچھ جیتا تھا کانفرنس کی میز پر وہ ہار گئے۔ اب ایوب اور موسیٰ کیسے کہتے کہ میدان جنگ میں ہم نے کچھ نہ جیتا تھا وہ تو ستمبر 65ء کی جنگ کو ہماری فتح قرار دے چکے تھے۔ اور قارئین یہی ہماری قوم کا بڑا المیہ ہے۔ جو آدمی جتنا زیادہ جھوٹ مارنے کا ماہر ہوگا، وہی قوم کو زیادہ بے وقوف بنائے گا۔ اور آج بھی یہی حالت ہے تب ہی ہماری قوم عذاب سے دوچار ہے۔ جو ختم ہوتا نظر نہیں آتا۔ اور ستمبر 65ء کی جنگ کے بعد میری ''ناکہ بندی'' شروع ہوگئی کہ میں سارا سچ لکھ کر کہیں شائع نہ کرا لوں۔ پہلے تو عزیزم کیپٹن محمد صفدر (بعد میں جنرل اور گورنر پنجاب) کو میرے ساتھ ''نتھی'' کر دیا کہ میں پلٹن کو منظم کرنے کے علاوہ اور کچھ نہ سوچوں۔ اس کے بعد کرنل شیر محمد جن کا ذکر پیرا 93 اور 94 میں ہو چکا ہے وہ لاہور پہنچ گئے کہ ان کو فوج نے واپس بلا لیا تھا۔ سب اوپر والوں کو معلوم تھا کہ میں شیر محمد کا ہر مشورہ تسلیم کرتا ہوں تو شیر محمد کے ساتھ اوپر والوں نے رابطہ باندھ کر مجھے کچھ ''ٹھنڈا'' کرنے کی کوشش کی۔ لیکن ساتھ ہی ایک نئی پلٹن کو کھڑا کرنے کے لیے کہ مجھے اس کا کرنل بنایا جائے گا مجھے لاہور سے ہٹا لیا کہ میں اخبار والوں سے دور رہوں اور مردان میں یہ پلٹن کھڑی کر کے یہ عاجز کوئٹہ پہنچا۔ اور دو تین ماہ بعد حالات بھی ٹھنڈے پڑنے لگے اور فوج میں بے شمار لوگوں کو ترقیاں مل گئیں۔ اور یحییٰ خان کو فوج کی سربراہی مل گئی اور اس کا سایہ حمید اس کا نائب بن گیا۔ جب ایسے بے کردار لوگ اوپر آ رہے تھے تو وہی کچھ ہونا تھا جو ہمارے ساتھ 1971ء میں ہوا۔ لیکن اس عاجز نے جو کچھ اپنے کھلے خط مورخہ 14 اگست 1997ء میں لکھا ہے کہ

اللہ تعالیٰ نے فرمایا تھا کہ ہاں اس بستی کو تباہ کر دو کہ اس عابد وزاہد نے بھی لوگوں کو میری نافرمانی سے نہ روکا، تو میں نے قوم کے لیے یہ تبلیغ جاری کی ہوئی ہے جس کا ذکر پیراگراف 76 میں ہو چکا ہے کہ کس طرح جنرل احسان الحق ڈار بھی 1967ء سے میرا ''سہارا'' بن گئے۔

120۔ اب کہانی کو اور مختصر کرتا ہوں کہ جی ایچ کیو میں پہنچ کر ہلال اخبار کو جو رنگ دیا وہ ذکر تفصیل سے ہو چکا ہے۔ لیکن میں نے یہ تبلیغ عام کر دی کہ موجودہ دفاعی طریقہ کے بجائے ہم نظریہ جہاد کو اپنائیں اور 1969ء میں نئے متعین ہونے والے چیف آف دی جنرل سٹاف جنرل گل حسن کو لکھ کر ایک لمبا چوڑا مسودہ پیش کیا، کہ 1965ء کی جنگ سے پہلے بھی اس عاجز نے بہت شور مچایا کہ ہم جنگ کی تیاری کریں اور بعد میں بھی بہت شور کر چکا ہوں کہ وہ جنگ اگر ہم 17 دن لڑ سکے تو آنے والی جنگ سات دن یا 27 دن لڑ سکیں گے۔ خدارا نظریہ جہاد کو اپنائیں، جس میں بنیادی چیز جہاد بالنفس ہے کہ اسلامی اقدار کی سخت پیروی کرنا ہوتی ہے۔ اور پوری قوم جہاد میں شریک ہوتی ہے۔ موجودہ طریقہ پر واہ! واہ کر کے نہیں بلکہ عملی شرکت ہوتی ہے وغیرہ۔ اس مسودہ کی کاپی آج بھی میرے پاس موجود ہے۔ اور پھر 14 ستمبر 1970ء کو تو سب لگی لپٹیاں ختم کر دیں کہ ایوب ہال میں چھ سو افسران کے سامنے کھلے طور پر یحییٰ خان اور اس کے حواریوں کو کہا کہ وہ توبہ وندامت کر کے بادشاہ بابر کی نقل میں اپنی شراب کی بوتلیں توڑ دیں۔ ورنہ وہ ملک کے ٹکڑے ہونے پر صدارت کریں گے اور ان کی فوج کا ''چھاتہ'' پاش پاش ہو جائے گا۔ میں نے یہ اعلان بھی کیا کہ میرا یہ بیان ایک روحانی ضرورت بھی ہے کہ فضا میں ریکارڈ ہو جائے کہ ایک آدمی تو

اس مجلس میں موجود تھا، جس نے سب کو اللہ تعالیٰ کی نافرمانی سے روکا۔ اور سب کچھ لکھ کر 15 اکتوبر 1970ء کو یحییٰ خان کے ملٹری سیکرٹری کو ایک مسودہ دے آیا۔ جس کی کاپی اب بھی میرے پاس موجود ہے۔ لیکن افسوسناک بات یہ ہے کہ ہماری قوم اور دینی جماعتوں کے سربراہ مومن کی فراست سے اتنے عاری ہیں کہ جماعت اسلامی کا کم علم مولوی طفیل اعلان کر رہا تھا، کہ یحییٰ خان قوم کو اسلامی آئین دے گا۔ (توبہ میرے اللہ) یحییٰ خان جیسے بے کردار نے وہی کچھ کرنا تھا یا دینا تھا جو ہمارے ساتھ 1971ء میں ہوا۔ یہ عاجز اپنے مضامین میں پوری کہانی لکھ چکا ہے کہ ایک دفعہ مجھے فوج سے ریٹائر کر کے مارچ 1971ء میں پھر واپس بلا لیا گیا کہ میں پریس کو کنٹرول کروں۔ لیکن میں جلدی مشرقی پاکستان چلا گیا کہ دیکھوں کہ ہم اکٹھے رہ سکتے ہیں یا نہیں کہ 1952ء میں زبان کے جھگڑے کے وقت میں ڈھاکہ شہر کا کمانڈر تھا۔ اور اسلام کا نام لے کر حالات کنٹرول کیے تھے۔ اور ساتھ لکھا تھا کہ اسلام ہی دونوں خطوں کو اکٹھا رکھ سکتا ہے۔ اب جا کر دیکھا کہ وہاں بھی ''ہم ادھر اور تم ادھر'' ہو چکا تھا۔ اور اسلام کو ''دیس نکالا'' مل چکا تھا۔ جنرل نیازی اور دوسرے حکمرانوں کو بہت سمجھایا کہ یحییٰ خان کو اسلام کے نفاذ کے لیے کہیں۔ اگر وہ ایسا نہیں کر سکتا تو عزت بچانے کے بارے کچھ سوچو کہ ہم وہاں جنگ نہیں لڑ سکتے۔

121۔ یہ جائزہ بہت وسیع ہے کہ اگست 1971 تک جو حالات اس عاجز نے دیکھے اور رپورٹ دی کہ مشرقی پاکستان میں ہم صرف ''چند دن'' جنگ لڑ سکتے تھے۔ اور اس سلسلہ میں اس جنگ لڑنے کا کوئی واضح مقصد سامنے ہونا چاہیے تھا، کہ زیادہ سے زیادہ دشمن کو ہم وہاں پر ''الجھا'' کر مغربی پاکستان

سے بھارت پر حملہ کر کے بہت کچھ حاصل کر سکتے تھے۔ پھر جب مشرقی پاکستان میں فوجی حالات ہمارے ''بس'' کے نہ رہتے، تو چٹاگانگ کے پہاڑی علاقے میں ''اکٹھے'' ہو جاتے اور جنگ کو طول دیتے۔ اور جب سب کچھ ہار بیٹھتے تو برما کی طرف نکل جاتے یا شمال کی طرف کو ''اجتماع'' کر کے چین کی طرف نکل جاتے، یا گروہوں میں بھارت میں داخل ہو جاتے اور بھارت کو اندرونی جنگ سے دوچار کر دیتے۔ افسوس! ہمارے رہنماؤں نے کوئی عزت اور بھلائی والی بات نہ سوچی اور جنرل نیازی کو ''تسلیاں'' دیتے رہے کہ یا چین والے ہماری مدد کریں گے یا امریکی بیڑہ ہماری ''حفاظت'' کے لئے پہنچ جائے گا۔ جنرل نیازی اپنی کتاب میں جو فوج کی بہادری سے لڑنے کا ذکر کرتا ہے، وہ سب کچھ سر آنکھوں پر، لیکن یہ سب کاروائی ''بے مقصد'' تھی۔ نیازی جو میرے ذاتی مشاہدے میں ایک بہادر کیپٹن یا میجر تھا، اس نے جس بے عزتی سے ہتھیار ڈالے، وہ اس کی سب ''بہادریوں'' پر پانی پھیر دیتا ہے۔ نیازی کے لئے اسلامی طریقہ یہ تھا کہ وہ اعلان کرتا کہ ہمارے اوپر کے رہنماؤں نے اس کے ساتھ اور اس کی فوج کے ساتھ ''دھوکہ'' کیا ہے۔ اور اب صورت حال یہ ہوگئی ہے کہ وہ حالات پر مرکزی کنٹرول نہیں کر سکتا، حالات ''مقامی'' ہو گئے ہیں۔ اس لئے جو لوگ صورت حال کا مقابلہ نہ کر سکنے کی وجہ سے کسی جگہ ہتھیار ڈال دیتے ہیں، میں ان سے ہرگز ناراض نہ ہوں گا۔ لیکن جو لوگ سلطان ٹیپو کی طرح آخری گولی تک لڑنے کو تیار ہیں، میں ان میں سے ایک ہوں۔ اس سلسلہ میں فیصلہ ''مقامی'' طور پر مل جل کر کریں۔ البتہ ہمارے ساتھ ہمارے اوپر والوں نے وہی کچھ کیا ہے جو اہل کوفہ نے حضرت امام حسین

رضی اللہ عنہ کے ساتھ کیا تھا۔ میں خود حضرت امام حسین رضی اللہ عنہ کی سنت کو پورا کروں گا۔ اور مجھے اُن کی طرح چراغ بجھانے کی بھی ضرورت نہیں۔ قارئین! یہاں پیرا110 سے استفادہ کریں کہ دشمن کے گھیرے میں آجانے کے بعد ہمارا رویہ کیا تھا۔ قوم نے یا ہمارے بڑوں نے ہماری ''قدر'' نہ کی تو نتیجہ 1971ء میں دیکھ لیا۔

122۔ اب جو کچھ ہوا قوم کو معلوم ہے اور یہ عاجز تفصیلی مضامین لکھ چکا ہے کہ مغربی پاکستان میں سازش بڑی گہری تھی کہ فوجی طور پر جو کچھ ہم حاصل کر سکتے تھے، وہ بھی حاصل نہ کیا۔ یحییٰ خان نے ''تین گروپ'' بنائے ہوئے تھے۔ ایک گروپ جنرل بچو کریم وغیرہ کے تحت مجیب الرحمٰن کے ساتھ رابطے میں تھا۔ وہ تو فیل ہو گئے۔ بھٹو کے ساتھ یحییٰ خان نے ڈبل رابطہ باندھا ہوا تھا کہ اپنے چیف آف سٹاف جنرل پیرزادہ کے ذریعہ سے اور دوسرا جنرل گل حسن اور ایئر مارشل رحیم کے ذریعہ سے اور بھٹو نے پکا وعدہ کیا ہوا تھا کہ وہ یحییٰ کو صدر رکھیں گے۔ تیسرا گروپ جن کی مدد سے یحییٰ خان حکومت چلا رہا تھا اس کا سربراہ یحییٰ کا سایہ جنرل حمید برہمی تھا۔ اور جنرل ابوبکر مٹھا اور جنرل خداداد کے علاوہ جنرل غلام عمر بھی ان میں شامل تھا۔ جو پاکستان کا'' کسینجر'' بنا ہوا تھا۔ اوران کے ذریعہ سے یحییٰ خان نے اسلام پسندوں اور ملک کے شرفا یا Sober لوگوں کے سر پر'' ہاتھ'' رکھا ہوا تھا یا ان کا'' گاڈ فادر'' بنا ہوا تھا۔ اوران کو کہا ہوا تھا کہ وہی لوگ اس کے جانشین ہوں گے۔ تو سقوط ڈھاکہ کے بعد یحییٰ خان نے ان لوگوں کو شہ دی کہ مگر مچھ کے آنسو بہا کر یہ لوگ ایوب ہال میں فوج کے افسران سے'' اعتماد کا ووٹ'' لیں کہ بے بسی تھی آئندہ ٹھیک کام کریں گے۔ ادھر بھٹو گروپ کے لیے یہ نادر موقع

تھا کہ ان لوگوں کو کھری کھری سنا کر ان کی ''ایسی تیسی'' کی جائے اور گل حسن گروپ کے لوگ مجھے بھی ''تلاش'' کر رہے تھے کہ میں یہ ''محاذ'' کھولوں۔ لیکن میں ایوب ہال میں ذرا دیر سے پہنچا۔ تو دیکھا کہ ایک اودھم مچا ہوا ہے۔ کہ ایک طرف دونوں گروپوں کے جھوٹے لوگ اپنے اپنے جھوٹوں کی ''پٹاریاں'' کھول کر ایک دوسرے پر ''بمباری'' کر رہے تھے۔ تو ویٹرنری کے شریف کرنل افتخار یا ای ایم ای کے ایک دانشور قسم کے کرنل بعد میں بریگیڈیئر اختر علی کوشش کر رہے تھے کہ کوئی مثبت اور تعمیری فیصلہ کیا جائے، تو مجھے مجبور ہو کر گرجدار آواز میں اعلان کرنا پڑا، ''سب خاموش ہو جائیں۔ آج سے تقریباً ایک سال پہلے اسی جگہ آپ میں سے ستر فی صد افسران موجود تھے۔ تو اس عاجز نے جو پیش بینی کی تھی وہ آج پوری ہو گئی۔ لیکن اس دن کسی ایک آدمی نے میری تائید نہ کی۔ اب تم شکست خوردہ جنرل حمید پر شیر نہ بنو۔'' اور پھر سیدھے طور پر جنرل حمید سے سوال کیا کہ'' کیا وہ اور اس کے ساتھی آج بھی توبہ و ندامت کرنے کو تیار ہیں؟ تو بات آگے بڑھائی جا سکتی ہے۔'' تین دفعہ دہرائی کے باوجود حمید خاموش رہا۔ اور قارئین یہ ہے ہمارا قومی کردار کہ ایسے المیہ کے بعد زبانی کلامی بھی ہمارے رہنما توبہ کرنے کو تیار نہ تھے۔

123۔ تو اس عاجز نے گرجدار آواز میں اعلان کیا۔ جنرل حمید صاحب اور باقی سامعین سن لیں۔ آپ لوگ توبہ کے لیے تیار نہیں۔ تو جس عذاب میں ہم'' گرفتار'' ہیں اس میں ''اضافہ'' ہو گا اور ہم پر حکمران کے طور پر ''براجمان'' ہونے والا پشاور پہنچنے والا ہے (یعنی بھٹو)۔ ایئر مارشل رحیم اس کو خوش آمدید کہنے کے لیے پشاور پہنچ چکا ہے۔ میرے سامنے بیٹھے جنرل گل حسن

اس کو'' حفاظت'' مہیا کرنے کا'' بندوبست'' کر چکے ہیں۔ وہ پنڈی پہنچ کر اوپر کا نیچے اور نیچے کا اوپر کردے گا۔ آپ اپنا اور ہمارا وقت ضائع نہ کریں اور Relax کریں یہ کھیل تمہارے بس سے باہر نکل چکا ہے۔ قارئین بھٹو پنڈی پہنچا تو اس کو بتا دیا گیا کہ سب فوجی جنرل اپنی وقعت کھو چکے ہیں۔ تو اس نے یحییٰ خان کو'' گھاس'' نہ ڈالی اور جنرل حمید گروپ کو بے عزتی کے ساتھ فوج سے فارغ کردیا۔ گو یہ لوگ اور خاص کر جنرل حمید اس سے بدتر بے عزتی کے حق دار تھے۔ لیکن بھٹو کی بات بھی ''بلی دودھ کی رکھوالی'' والی تھی۔ اس کو حکومت اور شہرت چاہیے تھی۔ مشرقی پاکستان کو'' لات مارنے'' والوں کا وہ'' سرغنہ'' تھا، کہ اس کو مغربی پاکستان کی حکومت ملے اور اس کی یہ عملداری چھوٹی ہوتی ہوتی سندھ تک رہ جاتی یا صرف لاڑکانہ تک، تو اس کی بلا سے نہ اس کا کوئی دین ایمان تھا، نہ اصول۔ لائف کو وہ ایک ''فراڈ'' سمجھتا تھا۔ اور اس کا کردار ایک دس نمبر بدمعاش والا تھا۔ کہ وہ ایک شعبدہ باز اور بہروپیا تھا۔ کیا پاکستان ہم نے اس لیے بنایا تھا کہ بھٹو جیسے لوگ ہمارے حکمران بنیں؟ توبہ میرے اللہ۔ بھٹو نے تمام رکھ رکھاؤ ختم کردیئے۔ وہ یحییٰ سے بھی بڑھ کر بدکردار تھا۔ اور رب تعالیٰ نے ایسے آدمی کو ہمارا حکمران بنا کر ہمیں عبرت حاصل کرنے کی طرف ترغیب دی۔

124۔ بھٹو بھی حکومت پر براجماں ہونے کے جلد بعد ایوب ہال پہنچ گیا۔ اور محبّ الوطنی اور شرفا کا لبادہ اوڑھ کر ایک ''مدبرانہ تقریر'' کردی۔ اس عاجز نے بھی دیکھنے کے لیے ایک سادہ سا سوال پوچھا کہ صدر صاحب کس سیاسی فلسفہ سے ہم پر حکومت کریں گے؟ بھٹو تاڑ گیا کہ سوال میں'' گہرائی'' ہے۔ اور

وہ سوچ میں پڑ گیا اور پھر اپنی شعبدہ بازی سے کام لیا اور کہنے لگا ''لا الہٰ الا اللہ میرا سیاسی فلسفہ اسلام ہے۔'' گو یہ بہت بڑا جھوٹ تھا۔ لیکن ایوب ہال تالیوں سے گونج اٹھا۔ لیکن حکومت آسان کام بھی نہیں۔ ہر معاملہ میں اس کی شعبدہ بازی نہ چل سکی تو فروری 1972ء میں وہ پھر ایوب ہال میں آ دھمکا کہ کچھ رعب جمانا چاہتا تھا۔ اور بغیر سوالوں کی اجازت دیئے چل پڑا۔ میں کھڑا ہو گیا اور اونچی آواز میں کہا ''صدر صاحب آپ اس طرح نہیں جا سکتے۔ میرے پاس بہت سوالات ہیں اور اول سوال یہ ہے کہ کہاں ہے تمہارا اسلام، کہ پچھلی دفعہ اس ہال میں آپ نے تالیاں بجوائیں۔ آپ کہتے ہیں کہ میں تھوڑا سی شراب پی لیتا ہوں۔ یزید بن معاویہ بھی تھوڑی سی شراب ہی پیتا تھا۔ اور ہاں آپ تو بڑے جمہوریت نواز ہیں۔ جمہوریت سے اس ملک کو چلائیں ایوب اور یحییٰ کی طرح ''بندوق'' ہمارے کندھے پر رکھ کر تو حکومت نہ کریں۔ اور ہاں یہ سقوط مشرقی پاکستان فوجی المیہ ضرور ہے لیکن اس کے تم سیاستدان خاص کر مجیب الرحمٰن اور آپ ذمہ دار ہیں۔ یہ مت کہنا کہ تم سویلین ہو تو مجھے یہ کہنے کی ہمت ہوئی ہے، ایسی بات نہیں ہے۔ میں نے تو فوجی حکمرانوں کو اور سخت باتوں کے علاوہ ان کے عبرتناک انجام کے بارے میں بھی خبر دی تھی۔ اور ایسا ہی عبرتناک انجام آپ کا ''منتظر'' ہے۔ البتہ توبہ اور ندامت کر کے اس سے بچ سکتے ہو وغیرہ۔'' میں نے کوئی لگی لپٹی نہ چھوڑی اور بھٹو کے ساتھ بعد میں چائے کے دوران بھی کافی باتیں ہوئیں اور بھٹو کو اندازہ ہو گیا کہ یہ ملک فوج کے ان وفادار لوگوں کی وجہ سے چل رہا ہے جو مذہب کی طرف مائل ہیں اور ہر حکومت کے وفادار رہتے ہیں، تو بھٹو نے دونوں''

بادشاہ گروں'' گل حسن اور رحیم کو اور زیادہ بے عزتی کے طریقے سے فارغ کر دیا۔ گو وہ بھی اس سے بدتر بے عزتی کے حق دار تھے۔ گل حسن کی جگہ تو ٹکا خان کو لایا گیا۔ لیکن فضائی فوج میں مذہب والوں کی اتنی وقعت نہیں ہے تو وہاں چھپے قادیانی رحیم کی جگہ وہ پکے قادیانی ظفر چوہدری کو لے آیا۔ اور ٹکا خان کی وفاداری کی وجہ سے اتنے سال حکومت کر گیا۔

125۔ اب بھٹو نے کوّے کی طرح اپنی ہوشیاری کو استعمال کیا کہ ٹکا خان کو بھی ریموٹ کنٹرول کے طور وزیر دفاع کے طور پر رکھا۔ نئی تنظیم کر کے تینوں افواج کا ایک ''سانجھا مرکز'' بنا کر وہاں جنرل محمد شریف کو چیئرمین بنایا۔ اور بری فوج کی سربراہی ضیاالحق کو سونپی۔ جس کی بھٹو کے مطابق فوج میں زیادہ ''وقعت'' نہ تھی کہ وہ مشرقی پنجاب کا مہاجر تھا۔ فطرت کھڑی ہنس رہی تھی کہ بھٹو سے بڑھ کر کسی بہروپیے شعبدہ باز اور فراڈیئے کی ضرورت تھی جو بھٹو کو تخت سے تختہ پر لے جائے کہ یہ عاجز اپنے مضامین میں لکھ چکا ہے کہ'' گکھڑ بابا نے تو اگست 1971ء ہی میں کہہ دیا تھا کہ بھٹو کے لیے پھانسی اور مجیب کے لیے گولی''۔ کہ انہوں نے اللہ تعالیٰ کے راز پاکستان کے ساتھ فراڈ کیا ہے۔ اور یہ کام ''ضیا باطل'' کے ہاتھوں ہوا، جس نے حق کا لبادہ اوڑھا ہوا تھا۔ کہ بھٹو کو وہاں پر تختہ پر چڑھایا گیا، جو جگہ اس کے تخت حاصل کرنے والی جگہ سے صرف 700 گز دور تھی۔

حذر اے چیرہ دستاں سخت ہیں فطرت کی تقدیریں

کہ بھٹو کو پھانسی چڑھانے والے کے بارے اس عاجز کو مارچ 1988ء میں مدینہ منورہ میں جو اشارہ ہوا تھا، اس کا ذکر شروع پیرا 7 میں ہو چکا ہے۔ اور بھٹو کو جو قادیانیوں کو اقلیت بنوانے کے لیے سہرے باندھے جاتے

ہیں، اس کا ذکر بھی شروع پیرا6 میں ہو چکا ہے۔ کیا کسی اور قوم کے ساتھ اتنے عبرتناک واقعات ہوئے ہیں؟ اور بھٹو کے علاوہ اس کے دو بیٹوں کو کس عبرتناک انجام سے دوچار ہونا پڑا۔ لیکن ہماری قوم ادھر دھیان ہی نہیں دیتی کہ یہ عذاب الٰہی ہے۔ اور ہم اللہ تعالیٰ سے معافی مانگیں اور بے نظیر کو ''پاکستان کی تقدیر'' نہ بنائیں کہ یہ مکار اور غدار خاندان از خود قوم کے لیے عذاب الٰہی ہیں۔ ضیاء الحق کیلئے ''غداری'' کا لفظ تو صحیح نہ ہوگا، لیکن ضیاء کا کوئی دین و ایمان نہ تھا۔ زبانی طور پر وہ کہتا تھا کہ اپنے اپنے ''مسلک'' پر قائم رہو۔ دوسروں کے مسلک میں دخل نہ دو، یعنی فرقہ داری اور گروہ بندی کو قائم رکھنا چاہتا تھا۔ خود اپنا ''مسلک'' ظاہر نہ کرتا تھا۔ لیکن نہ کبھی قائداعظمؒ کے مزار پر گیا اور نہ داتاؒ دربار حاضری دی، لیکن اشرف علی دیوبندی کے مرید سلمان ندوی کی قبر پر کراچی میں حاضری دی تھی۔ اور دیوبندیوں اکیلوں کی مجلس میں بریلویوں کے خلاف ریمارکس بھی پاس کر لیتا تھا۔ گو ظاہراً پیر کرم شاہ وغیرہ متعدد ''بریلویوں'' کو خوب استعمال کیا۔ بہر حال مکہ مکرمہ کی اسلام کی جہاد بالنفس والی زندگی اور اس کی تبلیغ یا نفاذ پر اس نے عمل کیا اور امریکہ والوں نے بھی اس کو یہ ''اجازت'' دے رکھی تھی اور مدینہ منورہ والی عشق بلاخیز کے قافلہ سخت جان والی زندگی پر عمل کے لیے امریکہ والوں نے اس کو ''منع'' کیا ہوا تھا۔ کہ وحدت فکر اور وحدت عمل یک جان نہ ہو جائیں۔ اس عاجز نے اس کو بے شمار خطوط لکھے۔ خاص کر افغانستان کے جہاد پر کہ یہ جو الگ الگ گروہ افغانستان میں برسر پیکار ہیں، ان کو ایک کیا جائے اور ہم بھی جہاد کو طرز زندگی کے طور پر اپنا کر ایک ہو جائیں۔ لیکن شاید امریکہ والے نہ مانے اور میں اپنی اور

جنرل احسان الحق ڈار کی کہانی پیرا80 میں لکھ چکا ہوں کہ ضیاء الحق کی وجہ سے ہمارا کام بند ہو گیا۔

126۔ میرے اکثر ''ہم خیال'' خاص کر پروفیسر مرزا منور مرحوم اور سید شبیر حسین مرحوم ضیاء الحق کے بڑے مداح تھے۔ اور وہ کہتے تھے اور بعد بھی کہتے رہے کہ شکر ہے ضیاء الحق آیا کہ بھٹو نے جو بے حیائی کا سیلاب بہا دیا تھا ضیاء الحق نے اس کے آگے بند باندھا۔ اور ''مصلحت'' ضیاء الحق کو اتنا کچھ ہی کرنے کی اجازت دیتی تھی۔ اس سے وہ کچھ زیادہ کرتا، تو انہی زمانوں میں ضیاء الحق کے پرخچے اڑا دیئے جاتے۔ لیکن میرے دو رفقاء کرنل شیر محمد مرحوم اور نذر الحق مرحوم میرے ساتھ اتفاق کرتے تھے کہ ضیاء الحق بہت بڑا ''منافق'' تھا۔ ذاتی غرض اور اپنی کرسی کے لیے وہ سب حدیں پھلانگ سکتا تھا۔ یہ عاجز عملی آدمی ہے اور ہر پہلو کو اس کے نتائج اور نتائج کے اثرات سے پرکھتا ہے۔ ضیاء الحق نے ہمیں کچھ بھی نہ دیا۔ اسلام کے ساتھ لوگوں کے دلوں میں نفرت پیدا ہوئی۔ اور بے دین بے نظیر نے اکثریت حاصل کر لی۔ ضیاء الحق نے ISI سے میرا پیچھا بھی کرایا۔ اور میرے لیے مارچ 1988ء میں مدینہ منورہ کا اشارہ کافی ہے کہ وہ ''حق'' نہیں ''باطل'' ہے۔ اور باطل بھک سے اڑ جاتا ہے۔

127۔ 1983ء میں جنرل احسان الحق ڈار کی موت میرے لیے بہت بڑا المیہ تھی۔ اس نے مجھے ہلا کر رکھ دیا تھا۔ کہ میں میدان میں اکیلا اور بے سہارا رہ گیا تھا۔ کرنل شیر محمد مایوس ہو کر گوشہ نشینی اختیار کر چکا تھا۔ اور میرے بغیر باقی لوگوں میں سے اکثر کو ملنا بھی نہ چاہتا تھا۔ اور بعض دفعہ اس پر ایسے اثرات ہوتے تھے کہ وہ تڑپنا شروع کر دیتا تھا۔ اور یہ ایک الگ مضمون ہے

کہ اب تو سائنس نے بھی تسلیم کر لیا ہے۔ کہ ہر انسان کے اندر سے کچھ روئیں اخراج کرتی ہیں جن کا ماحول پر اثر ہوتا ہے۔ یا خبیثہ کلمات اثر کرتے ہیں کہ یہ عاجز از خود 1968ء میں غلام پرویز مردود کی میگزین، طلوع اسلام کے اثرات سے جلنے لگتا تھا۔ اور یہ ایک ''روحانی مضمون'' بھی ہے۔ اس لیے میں نے تو درود شریف کے ورد سے نہ صرف ماحول کا مقابلہ شروع کر دیا ہے، بلکہ ایسی طاقت حاصل کر لیتا ہوں کہ اب تک میدان میں ہوں۔ تو 84-1983ء میں فیصلہ کیا کہ چلو قوم کو کچھ بتایا جائے کہ ان کو کیسے بے وقوف بنایا جاتا رہا۔ اور ایک کتاب لکھ ڈالی جس کا نام ''تاشقند کے اصلی راز اور قادیانیوں کی سازشیں'' رکھا۔ کہ اے لوگو بھٹو تمہیں خواہ مخواہ تاشقند کے شوشہ سے بے وقوف بناتا رہا۔ اب مجھ سے اصلی راز سنو کہ لیاقت علی سے لے کر ہر رہنما نے تمہیں کتنا اور کیسے بے وقوف بنایا۔ اس کتاب کو 1985ء میں بے حساب تعداد میں شائع کر دیا۔ اور بغیر نفع کے فروخت شروع کر دی اور لوگوں نے اس کتاب کو ہاتھوں ہاتھ لیا۔ میں خود نے اس کتاب میں توبہ وندامت بھی کی۔ اور گو پورا سچ شائع کرنا تو ناممکن تھا، لیکن میری بڑی حوصلہ افزائی ہوئی۔ لوگ مجھے کب سے حاجی صاحب کہتے تھے۔ لیکن ''کعبہ کس منہ سے جاؤ گے''، یہ الفاظ میرے لیے رکاوٹ بنے ہوئے تھے اور میرے آنسو بہتے رہتے تھے بلکہ میرے عزیز دوست برگیڈیئر اختر علی کا خیال تھا کہ یہاں میری یہ حالت ہے وہاں کیسے جا سکتا ہوں۔ شاید علامہ اقبالؒ کی طرح میں اس سعادت سے'' محروم'' رہوں۔ لیکن حضور پاک صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے سپاہی کے نام کی وجہ سے اور میرے آقا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی سفارش سے 1986ء میں

بلاوا آ گیا۔

128۔ قارئین خانہ کعبہ اور روضہ رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی زیارتوں کے اس عاجز کے تاثرات کچھ منفرد اقسام کے ہیں اور اپنی قسم کے آپ ہیں۔ کچھ باتیں اس لیے نہیں لکھتا کہ خود نمائی کا ڈر لگتا ہے اور کچھ واردات عام فہم نہیں۔ بہر حال رب سبحانہ اور حضور پاک صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے مخاطب ہونے کی سعادت کے بعد جو جوابات ملتے ہیں تو عاجزی سے کئی دفعہ اپنے اس مادی بدن کو ''غائب'' پایا اور عدم میں چلے جانے سے ضرور لطف اندوز ہوا، اس لیے واپس آ کر اپنے تاثرات کو تحریری شکل دینے کی بجائے اشارہ ہوا کہ جو ''لطائف'' حاصل کیے ان کے ساتھ اپنی کتاب حضور پاک ﷺ کے جلال و جمال، جس کا تفصیلی ذکر پیرا 80 تا 85 میں ہو چکا ہے، کی نوک پلک سنوار دو اور متعلقہ مشاہدات کو کتاب میں شامل کر دو۔ تو 1987ء کا سال اس کام پر گزر گیا۔ 1988ء کے شروع میں بڑے لڑکے ڈاکٹر خالد ریاض کے بلاوے پر امریکہ جا رہے تھے تو عمرہ کی سعادت نصیب ہو گئی۔ عشاء کی نماز کے بعد خانہ کعبہ میں داخل ہوئے تو جو نور برستا دیکھا ایسی کیفیت اور منظر سے پہلے کبھی لطف اندوز نہ ہوئے تھے کہ اس نور نے ہمیں اپنی لپیٹ میں لے لیا۔ بیوی ساتھ تھی جس سے میں بار بار پوچھتا تھا کہ یہ خواب تو نہیں۔ اور اب بھی جب وہ کیفیت یاد آتی ہے تو بدن سرور سے بھر جاتا ہے۔ خانہ کعبہ سے ''ہمکلام'' ہونے کی کیفیت سے تو حج کے زمانے میں بھی گزرے تھے لیکن اس دفعہ تو صورت حال ہی بالکل نرالی تھی۔ دوسرے دن جب خانہ کعبہ سے مدینہ منورہ جانے لگے تو الوداعی سلام بڑا نمایاں تھا۔ مدینہ منورہ عشاء کی نماز کے بعد پہنچے کہ روضہ مبارک

بند ہو چکا تھا۔ اس لیے دوسرے روز تہجد کے وقت مسجد نبوی ﷺ کا دروازہ ہماری آنکھوں کے سامنے کھلا۔ اندر داخل ہوئے تو دنیا ہی تبدیل ہوگئی۔ عزت بخاری کا یہ شعر کہ

ادب گاہست زیر آسمان از عرش نازک تر

سنا ہوا تو تھا۔ اور حج کے وقت کی حاضری کے زمانے میں عاجزی کی کیفیات چھائی رہیں۔ لیکن اس دفعہ تو تصور میں دیکھا کہ خوش قسمت انسان صف باندھے حضور پاک صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے جمال سے اس طرح مستفیض ہو رہے ہیں کہ جہاں دنیا و مافیہا سے بے خبر ہیں۔ صرف اپنے جد امجد جناب حضرت علی کرم اللہ وجہٗ نے مسکراہٹ سے ہماری طرف بھی توجہ فرمائی جیسے فرما رہے ہوں کہ آنا مبارک ہو۔ ایسے انبوہ کا تصور پہلی دفعہ ہوا جس کو یاد کر کے یہ عاجز زندگی کی قید کی مشکل گھڑیوں میں تخلیقِ کائنات کے مقاصد میں آقا ﷺ کی غلامی کی وجہ سے رحمت کا امیدوار بن جاتا ہے۔

129۔ امریکہ کے میرے چھ ماہ کے قیام میں میرے لیے ''کچھ'' بھی نہ تھا۔ بظاہر صاف شفاف زندگی کے کسی شگاف سے کچھ ''باطن'' اگر نظر آ جاتا تو اس میں اندھیرا ہی اندھیرا یعنی برائی ہی برائی تھی۔ جس کا اظہار معاشرہ کے لیے چند سال پہلے اس وقت ہوا جب نیویارک میں اندھیرا ہو گیا تھا۔ اور اب طوفان کے دوران برائی کھل کر سامنے آ گئی۔ اور ان کے حکمرانوں کے ظلموں کا مظاہرہ ظاہری طور پر افغانستان اور عراق میں ہو رہا ہے۔ بہرحال امریکہ سے واپس آئے تو چند دنوں بعد ضیاء الحق کے پرخچے اڑ گئے۔ مجھے جو خانہ کعبہ اور روضہ رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم دونوں مقامات پر دعا القا

ہوئی تھی اور اس کے الفاظ یہ تھے رب نبی محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم تو مقلب القلوب ہے۔ ہمارے دلوں کو پھیر دے اور ہمیں عزت اور غیرت کی زندگی عطا فرما کہ ہم حضور پاک صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے جمال سے عالم اسلام کو منور، معطر اور مطہر کریں اور حضور پاک ﷺ کے جلال سے غیرت حاصل کر کے عشق بلا خیز کا قافلہ سخت جان بن کر جہاد کو طرز زندگی کے طور پر اپنا لیں۔ تو یہ عاجز اب اپنے آپ کو یہی دعا عام کرنے کی تبلیغ تک محدود رکھنا چاہتا تھا کہ نئے بادشاہ گر جنرل اسلم بیگ نے بریگیڈیئر صدیق سالک کی جگہ ISPR میں ایک جنرل ریاض اللہ کو تعین کیا۔ کہ تمام جنگوں پر سیمینار کیئے جائیں اور حقیقت تلاش کی جائے کہ ہم کیوں ناکام ہوئے اور بسم اللہ کشمیر کی 1947-48ء کی جنگ سے کی جائے۔ اس سلسلہ میں پہلا سیمینار راولپنڈی میں ہوا۔ اور بریگیڈیئر صدیق ستی، میجر محمد خان جرال اور بریگیڈیئر عطا محمد ملک نے بڑی سچی اور تحقیقی باتیں کیں۔ لیکن جنرل نوابزادہ شیر علی اور کرنل مختار گیلانی وغیرہ نے جب ''کچھ غلط بیانی'' سے کام لیا تو اس عاجز نے نہ صرف ان کو ٹوکا بلکہ جب اپنی تحقیق پیش کی تو ہر جگہ سے تحسین کی آوازیں آنے لگیں۔ بہرحال نتیجہ یہ نکلا کہ یہ عاجز ان سیمینارز کا ''روح رواں'' بن گیا۔ اور اکثر سیمینار جو نو مقامات پر ہوئے ان میں مجھے خصوصی دعوت سے لے جایا گیا۔ اور باقیوں کے ویڈیو سنا دیئے گئے اور 1990ء کے شروع میں فیصلہ ہو گیا کہ اس سلسلہ میں کتاب یہ عاجز لکھے گا۔ جس کا خرچ حکومت کے ذمہ ہو گا اور کل خرچ کا 18 فی صد مجھے اعزازیہ دیا جائے گا۔

130۔ بعد میں جنرل ریاض اللہ اور میرے درمیان اس سلسلہ میں ایک لکھا ہوا

معاہدہ کیا گیا، کہ یہ عاجز سب کچھ کسی حوالہ کی مدد سے لکھے گا۔لیکن جائزے اپنی سوچ کے مطابق ہوں گے جن میں یا ساری کتاب میں ISPR یا کوئی حکومتی ادارہ کوئی تبدیلی نہ کر سکے گا۔اور کتاب نہ بھی شائع ہو سکی تو کتاب کے ڈرافٹ تیار ہونے کے فوراً بعد آدھا اور چھ ماہ بعد باقی اعزازیہ مصنف کو اندازۃً طور پر دیا جائے گا۔کتاب دو جلدوں میں ہونا تھی اور میں نے دسمبر 1991ء تک ڈرافٹ تیار کرنا تھا۔ پہلی جلد تو اس عاجز نے مئی 1991ء میں تیار کر کے جنرل ریاض اللہ کو پیش کر دی۔ جو بہت خوش ہوا اور اس نے میری بہت مدد بھی کی تھی۔لیکن وہ اگست 1991ء میں فوت ہو گئے اور جنرل ڈار کی وفات کے بعد میرے لیے یہ دوسرا المیہ تھا۔ بہرحال میں نے دوسری جلد بھی ریاض اللہ کے جانشین میجر جنرل جہانگیر نصر اللہ کو دے دی۔اس کے بعد جو کچھ میرے ساتھ ہوا اور جس ذلالت کا مظاہرہ نہ صرف جہانگیر نصر اللہ نے کیا بلکہ تین پشتوں سے خاندانی تعلق والے میرے منہ بولے بیٹے جنرل آصف نواز نے کیا، وہ کہانی اختصار سے بیان کرنے کے لیے بھی کئی صفحات چاہئیں۔اور بعد میں جنرل آصف نواز کی قبر کشائی سے جو بدبو ماحول میں پھیلی تھی تو اس میں ''عبرت'' تھی۔اکتوبر 91ء میں کتاب پر سید شبیر حسین نے پیشگی تبصرہ کر دیا تھا کہ مصنف نے اینگلو امریکن بلاک کی جنوبی ایشیاء کے مسلمانوں کے خلاف تمام سازشوں کے پردے چاق کر دیئے ہیں۔اور آصف نواز امریکنوں کے حکم کے تحت کتاب کی اشاعت میں ''روڑا'' بنا ہوا تھا کہ امریکن اس کو ''ایوب ثانی'' بنا کر ہمارے ساتھ وہ کرنا چاہتے تھے جو آج کل کر رہے ہیں۔آصف نواز کو ''بھارت یاترا'' کی دعوت بھی مل چکی تھی۔ اور بھارتی جنرل کو بلا کر

آصف نواز شالا مار باغ کا ''تقدس'' بھی اس کے ناپاک قدموں سے مجروح کرنا چاہتا تھا۔ جس کے دفاع کے لیے آصف نواز کے بھائی ناصر نواز سمیت ہم نے ستمبر 1965ء کی جنگ میں عظیم قربانی دی تھی (فاعتبروا یا اولی الابصار) آصف نواز نے میجر جنرل معین الدین حیدر کے ذریعہ سے مجھے میری تقریباً دو لاکھ مزدوری یا اعزازیہ کی پیش کش کر دی بشرطیکہ میں نے جو سچ تلاش کیا ہے اس کو جلا دوں اور وعدہ کروں کہ یہ سب کچھ کہیں شائع نہ ہوگا۔

131۔ توبہ میرے اللہ۔ جہنم میں جائیں دو لاکھ روپے، میں اللہ تعالیٰ اور رسول پاک صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا چور کیسے بنوں۔ ذکر ہو چکا ہے کہ کتاب حضور پاک ﷺ کا جلال و جمال ہاتھوں ہاتھ بک گئی تھی۔ تو میں نے اس کتاب جہاد کشمیر کو کچھ abridge کر کے ایک جلد میں تبدیل کیا اور 1994ء کے اگست کے مہینہ میں اس کو بھی شائع کر دیا۔ اور اپنے خرچ سے بھی کم قیمت پر فروخت کرنے کا پروگرام بنایا۔ لیکن میں حیران ہوا کہ اس سچ اور حق سے لوگ اتنے ''ڈرتے'' تھے کہ کوئی بک سیلر کتاب لینے کو تیار نہ تھا۔ حالانکہ میں نے لفظ لفظ کسی حوالے سے لکھا تھا۔ اور کتاب کی کاپی سپریم کورٹ اور شرعی عدالت میں ریکارڈ کرا دی کہ حکومت پابندی لگانے سے پہلے معاملات کی کورٹ سے چھان بین کرائے۔ قارئین اب میں ایک اور سچی بات کا اعلان کرتا ہوں کہ ہم بڑی ڈرپوک قوم ہیں۔ اور ہمارے ساتھ جو کچھ ہو رہا ہے یا ہم سکھوں اور انگریزوں کی غلامی میں جو رہے اس پر دھیان دیا جائے کہ ہمارے اندر ایمان کی بھی کمی ہے۔ کرنل شیر محمد جو چھ سات سال ہوئے اب فوت ہو چکے ہیں۔ 1992ء سے

بالکل مایوس ہو کر گوشہ نشین ہو چکے تھے۔ اور میری کتاب پر یہ ردعمل سننے کے بعد مجھے کہنے لگے کہ بند کرو یہ تبلیغ، تم فریدالدین عطارؒ بننے کی کوشش نہ کرو۔ اگر وہ منگولوں کی یلغار کو نہ رکوا سکے تو تم کون ہوتے ہو آنے والی تباہیوں اور ذلتوں کو روکنے والے اور شاید بہت قربانیوں کے بعد ہم میں جان پڑ جائے کہ ع

اسلام زندہ ہوتا ہے ہر کربلا کے بعد

کرنل صاحب کی یہ بات میں اپنے کئی مضامین میں دہرا چکا ہوں۔ لیکن قوم کے لیے صراط مستقیم کی نشاندہی سے اب دستبردار کیسے ہو سکتا ہوں، کہ روز قیامت اپنے آقا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو کیا جواب دوں گا کہ اُن ﷺ کے سپاہی ہونے کی سعادت کو قائم نہ رکھ سکا۔ اس لیے جب بھی موقع ملا لوگوں کو اللہ تعالیٰ کی نافرمانی سے روکتا رہا۔

132۔ 4 نومبر 1995ء کو نوائے وقت نے نواز شریف کے نام میرا ایک کھلا خط کئی وجوہات کی وجہ سے شائع کر دیا کہ چند الفاظ میں کئی کتابوں کے مضامین کو اس خط میں سمو دیا گیا تھا۔ اور یہ تبصرہ بھی تھا اور نشان راہ بھی۔ علاوہ ازیں کچھ پہلے لوگوں کا کچا چٹھا بھی کھولا گیا تھا جو نوائے وقت کے ''ناپسندیدہ'' تھے۔ لیکن اشاعت کی ایک خاص وجہ یہ معلوم ہوتی ہے کہ نواز شریف کو کھلی دعوت تھی کہ وہ اسلامی نظام حکومت مجھ سے سمجھے، جس کے بارے تمام علماء اور دانشور ''نابلد'' ہیں۔ اب مجید نظامی کا خیال ہے کہ اسلام کو تو صرف وہی لوگ یعنی مجید نظامی وغیرہ سمجھتے ہیں اور قوم کی صحیح رہنمائی کر رہے ہیں۔ اور یہ میجر کون ہوتا ہے کہ اسلامی نظام حکومت سمجھتا ہو، اور باقی سب کو نابلد قرار دے۔ تو خط کے نیچے نواز شریف کی طرف سے مجھے گزارش بھی شائع کر دی

گئی کہ میں یہ ''اسلامی نظام حکومت'' نوائے وقت کے ذریعہ سے پوری قوم کو باور کراؤں۔ مجید نظامی کو خیال ہوا کہ میجر امیر افضل بھی اوروں کی طرح آئیں بائیں شائیں مارے گا۔ اور اس کی باتوں پر تبصرہ کر کے اس کی'' طبیعت'' صاف کردی جائے گی۔ میں نے تین چار مضمون اکٹھے بھیج دیئے کہ مضامین کا لفظ لفظ قرآن پاک اور سنت نبوی ﷺ کے حوالوں سے لکھا گیا تھا کہ اول اسلامی فلسفہ حیات اور جہاد طرز زندگی کے پہلوؤں کو سمجھا جائے اور نظام حکومت کو ان کے تابع کیا جائے کہ فقہ یا قانون بھی اس کی ایک مد ہو وغیرہ۔ یہ مضامین پڑھنے کے بعد مجید نظامی پر وارد ہو گیا ہے کہ وہ جو قائداعظمؒ اور علامہ اقبالؒ کو حضور پاک صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی نبوت میں شرکت دے کر جو نظام قوم کو پیش کر رہا ہے، اس کی تو میجر امیر افضل نے'' ایسی تیسی'' کردی ہے اور جو قلعے ریت کی بنیاد پر مجید نظامی بنا کر نوائے وقت کے ذریعہ سے قوم کی رہنمائی کرنے کے دعوے کر رہا تھا، میرے مضامین سے اس کو یہ قلعے مسمار ہوتے نظر آئے۔ تو وہ مضامین کیسے شائع کرتا۔ یہی ہمارا بہت بڑا المیہ ہے کہ ہمیں یہ معلوم نہیں کہ کون ہمیں گمراہ کر رہا ہے اور قوم بھول بھلیوں میں گرفتار ہے۔

133۔ بہرحال اس زمانے میں اس عاجز نے نواز شریف اور مجید نظامی کو متحدہ خطوط کی بوچھاڑ کردی کہ وہ جواب دیں کہ مجھے مضامین لکھنے کی دعوت دے کر اب ان کو کیوں سانپ سونگھ گیا ہے۔ مجید نظامی کو صاف کہا کہ ضیاء الحق کے زمانے میں یہ عاجز متحدہ خطوط میں ان دونوں کو ثبوت پیش کر چکا ہے کہ وہ دونوں اسلام کے نفاذ کے راستے میں بڑی رکاوٹ ہیں۔ نواز شریف کو الگ خطوط بھی لکھے کہ وہ میری مدد کریں کہ اس سلسلہ میں کتاب شائع کی

جائے۔لیکن نواز شریف نے کبھی کسی خط کا جواب نہ دیا۔ یہ عاجز پیراگراف 39 میں واضح کر چکا ہے کہ میرا یہ خط اسلامی نظام حکومت کی کتاب کی اشاعت کا باعث بن گیا۔ کتاب میں اس عاجز نے پورا پس منظر بیان کیا کہ مجید نظامی اور نواز شریف کس ''قماش'' کے آدمی ہیں۔ اور وہ کتنے جھوٹے اور وعدہ توڑنے والے ہیں۔ میں نے اس کتاب کی اشاعت میں بہت محنت کی اور بڑی مشکل سے پائی پائی جوڑ کر کتاب شائع کی۔ پہلا ایڈیشن لوگوں نے ہاتھوں ہاتھ لیا۔ اور دوسرا ایڈیشن بھی شائع ہو گیا ہے۔ اب قارئین پہلے پیرا کی تمہید کو دوبارہ پڑھیں۔ اور قوم کے نام مورخہ 19 فروری 96ء کے آدھے صفحہ کے خط سے استفادہ کریں کہ وہاں جس کتاب کا ذکر ہے یہ وہی کتاب ہے۔ دیکھ لیں کہ آدھے صفحہ کے خط میں جو کچھ بیان کیا، اس کی وضاحتیں ختم ہونے میں نہیں آتیں۔ اس سلسلہ میں اسلام کے ایک فرزند جنرل سیّد رفاقت کی تحریر پیش کی جاتی ہے۔

''میرے سامنے اس وقت جناب امیر افضل خاں کی تازہ تصنیف اسلامی نظام حکومت کی ایک کاپی ہے۔ میں موصوف کے مشن، ان کی شخصیت، ان سے میرے روابط کی تاریخ ان کا بحیثیت ایک محقق، مجاہد اور مصنف مقام اور ان کے طرز تحریر کے متعلق اپنے خیالات و جذبات کا پہلے بھی اظہار کر چکا ہوں اور وہ جگہ جگہ شائع بھی ہو چکے ہیں۔ لہذا انہیں اب دہرانا غیر ضروری سمجھتا ہوں۔ پھر بھی اس کتاب کے مطالعہ کے بعد میرے ذہن میں اٹھنے والے خیالات اور میرے دل پر گزرنے والے جذبات کا ذکر کرنا اپنے لئے سعادت سمجھتا ہوں۔

موصوف کے پاس مشاہدات تجربہ، تحقیق اور مطالعہ کا بے پناہ خزینہ موجود تو تھا ہی جسے وہ مضامین اور خطوط کی صورت میں متعلقہ اشخاص یا قارئین تک پیہم پہنچاتے رہے لیکن جب وہ پچھلے چند سالوں میں باقاعدہ تصنیف کی طرف متوجہ ہوئے تو گویا ایک بند تھا جو ٹوٹ پڑا۔ اور اب تو ان کے قلم کی رفتار، خیالات کے بہاؤ اور جذبات کی اٹھان کو دیکھ کر قاری پر ایک ہیبت کی سی کیفیت طاری ہو جاتی ہے۔ امیر افضل اب ایک طوفان کی صورت اور قوت اختیار کرتا جارہا ہے جو باطل کی ساری کرشمہ سازی کو خس و خاشاک کی طرح بہا کے لے جائے گا۔ اس خس و خاشاک میں وہ شخصیات بھی شامل ہیں جن کا اعتقاد ضعیف اور ایمان متزلزل ہے۔ اس عہد جہالت کی اصطلاحات، تلمیحات اور نظریات بھی شامل ہیں جنہیں یہ طوفانِ حق بحیرہ عرب میں ڈبونے کا عزم رکھتا ہے۔

میجر امیر افضل خاں صاحب نے ایک نیا طرز تحریر اور اسلوب بیان ایجاد کیا ہے جسے ہوا کے الٹے رخ اڑتے ہوئے شاہین کی پرواز سے تشبیہ دی جا سکتی ہے۔ بظاہر اُوہ ایک پُر عظمت بلندی سے ان واقعات، حادثات اور شخصیات کے ٹکراؤ یا تعاون سے بنتی اور بہتی تاریخ کا نظارہ کر رہے ہوتے ہیں۔ لیکن ان کی عقابی نگاہ ہر وقت اور ہر مقام پر اس شکار کی تلاش میں بھی رہتی ہے جو چوہے، بچھو یا سانپ کی طرح اسلام کے بنیادی اعتقادات کو کترنے یا ڈسنے سے کبھی گریز نہیں کرتی۔ اس قسم کے چوہے،

بچھو، یا سانپ (بشمول مارِ آستین کے) جہاں ذرا بھی حرکت کریں وہ امیر افضل کی عقابی نگاہ سے چھپ نہیں سکتے۔ یہ شاہین ایک ہی لپک اور جھپٹ میں ان مردود حشرات کو اٹھا لیتا ہے۔ اور دلائل کے پنجوں میں مسل کر پھینک دیتا ہے اور چند لمحوں کی اس ہیبت ناک مگر پُر شکوہ diversion (تبدیلی) کے بعد پہلی بلندی سے معمول کی پرواز میں لگ جاتا ہے۔ ان کا یہ انداز بیان قارئین کے لیے ایک خصوصی جاذبیت رکھتا ہے۔ میں نے خود جب بھی ان کی کوئی تحریر پڑھی تو نہ صرف اپنے شعور کو ان کی تحقیق سے محظوظ ہوتے پایا بلکہ اپنے اعتقادات کو بھی ایک تطہیر کے عمل سے گزرتے دیکھا۔

زیر نظر کتاب میں مصنف اسلامی نظام حکومت کی درست شکل پیش کرتے ہیں۔ کتاب کا بنیادی مقصد اور مرکزی نقطہ تو اسلامی نظام حکومت کا جامع خاکہ پیش کرنا اور اسے ایک مسلمان کے تصورِ حیات و ممات کے تناظر میں دیکھنا ہے۔ لیکن مصنف کو جائز طور پر شدت سے احساس ہے کہ اس سوال کا جواب دینا ہو گا کہ نظام حکومت کیوں اور کس کے لیے ہے اور اس سے بھی بڑھ کر یہ بات طے کرنا ہو گی، کہ خود انسان ہے کیا اور اس کی زیست کیوں اور کس کے لیے ہے۔ لہذا یہ کتاب نظام حکومت کے خاکہ سے بڑھ کر ان بنیادی اور ضروری سوالات کے جواب پیش کرتی ہے۔

امیر افضل خاں اب ایک تحریک کی صورت اختیار کر چکے ہیں۔

لیکن وہ کوئی نیا فلسفہ پیش نہیں کر رہے ہیں وہ تو صرف رسول عربی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے اسلام کے کلی اور بلاشرط نفاذ کے داعی ہیں اور ہر وہ شخصیت یا فلسفہ یا ادارہ یا اصطلاح یا روایت جو قرآن حکیم کے واضح احکام سے متصادم ہو یا رسول عربی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی اطاعت سے راہ فرار اختیار کرے، ان کے خلاف وہ پیہم حالت جنگ میں ہیں۔

134۔ قارئین ذرا اندازہ لگائیں کہ جنرل سید رفاقت نے کس خوبصورتی کے ساتھ میری ساری تحریک کو چند الفاظ میں بیان کر دیا ہے اور بیانات کے روح کو واضح کر دیا کہ امیر افضل زیادہ زور اس پر دے رہا ہے کہ انسان از خود کیا ہے۔ یعنی ہمارے آقا ﷺ کا یہ فرمان قارئین کو یاد دلا دیا کہ ''جس نے پہچانا اپنے نفس کو، اس نے پہچانا رب کی ذات کو''۔ بات ہی ساری انسانی زندگی کے مقاصد کو سمجھنے کی ہے۔ کہ اسلامی فلسفہ حیات کیا ہے اور اس کا نام سن کر مجید نظامی اور دیگر دانشوری کا لبادہ اوڑھنے والے فرار اختیار کر جاتے ہیں کہ اس میں مادر پدر آزادی نہیں۔ علاوہ ازیں جب ہم اپنے نفس کو پہچان جائیں تو انسانی زندگی کے مقاصد سامنے آ جاتے ہیں کہ ہم مسلمانوں کے پاس ہی صحیح فلسفہ حیات موجود ہے۔ اور باقی لوگ گمراہ ہیں تو ہمارے سامنے اہل مغرب اور دوسری باطل طاقتوں کی مرعوبیت بھی ختم ہو جاتی ہے۔ اور یہ جو ہم اہل مغرب کی غلط نقالی میں ہر وقت کوٹ پتلون اور ٹائی میں ملبوس پھرتے ہیں ایسی باتیں سمجھ آ جاتی ہیں کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام تو قرآن پاک کے مطابق ''ماقتلوا اور صلبوا'' تھے، یہ گمراہ لوگ غلط طور پر صلیب کے نشان کے طور پر ٹائی پہنے ہوئے ہیں۔ اور ان کے

معاشروں میں زیادہ گمراہی ہے اور دنیا کے وارث ہم ہیں۔ بشرطیہ ہم اسلامی فلسفہ حیات کی پیروی کریں۔ اور جب ایسا کریں تو اللہ تعالیٰ سوچوں اور اعمال میں ارتقاء کا سبب بھی پیدا کر دیتا ہے۔ یہاں پر اس اضافہ کی بھی ضرورت ہے کہ تمام ماڈرن دنیا کے سائنسدان یا بڑے بڑے دانشور، اس کائنات کے متعلق اپنی تحقیقات کے بعد مایوسی کا اظہار بھی کر دیتے ہیں۔ نوبل انعام یافتہ سٹیون وینبرگ کہتا ہے کہ اس کائنات کے تمام معاملات جتنے زیادہ قابلِ فہم نظر آتے ہیں، اس سے زیادہ بے معنی بھی نظر آتے ہیں۔ دوسرا نوبل انعام یافتہ جیمز ٹرائفل کہتا ہے، ''افسوس کہ اگر کروڑوں، اربوں سالوں کے بعد یہ کائنات ختم ہونے والی ہے، جب کوئی زندگی نہ ہوگی، کوئی فہم و ادراک نہ ہوگا، انسانیت کے جدوجہد کی یادیں نہ ہوں گی، تو پھر اس زندگی اور اس سارے جہاں کے ہونے یا نہ ہونے میں کیا فرق رہ جاتا ہے؟'' اس عاجز نے سولہ قسطوں کا ایک مضمون لکھا کہ یہ مغربی دانشور ''مایوس'' اس لئے ہیں کہ وہ تخلیقِ کائنات کے مقاصد اور اسلامی فلسفۂ حیات کے ''حیات بعدالموت'' کے تقاضوں سے بے خبر ہیں۔ اور تمام سائنسی دریافتوں کو قرآن پاک کے انکشافات کے تابع کر کے اسلامی فلسفۂ حیات کا غیروں کے باطل فلسفہ ہائے حیات سے موازنہ کر کے ثابت کیا کہ جیمز ٹرائفل صاحب، کائنات کے خاتمے یا اموات کے بعد بہت بہتر دنیا ہماری ''منتظر'' ہے وغیرہ۔ مجید نظامی نے شاید اس سب کو ردی کے ٹوکرے میں پھینک دیا۔ کہ نہ شائع کیا، نہ مجھے واپس کیا۔ اور نہ میرے خطوط کا جواب دیتا ہے، اور میری محنت ضائع ہو گئی۔

135۔ چنانچہ اس سلسلہ کا پس منظر یہ ہے کہ میری ملاقات ملک کے مایہ ناز سائنسدان سلطان بشیر محمود کے ساتھ ہوگئی تھی۔ جو کتاب Life after Death انگریزی میں لکھ چکے تھے کہ یہ کتاب بھی فلسفہ حیات کے کچھ مرحلہ جات کا بیان تھا۔ جہاں سائنسی دریافتوں کو بشیر صاحب نے بڑی خوبصورتی سے قرآن پاک کے انکشافات کے تابع کیا۔ بشیر صاحب جن کا ذکر پیرا88 میں ہو چکا ہے کہنے لگے کہ میں ان کی انگریزی کتاب کا ترجمہ کر کے ساتھ اسلامی پہلوؤں کے اضافے بھی کر دوں، جو تحقیق میں کرنل شیر محمد کے ساتھ مل کر کر چکا ہوں اور اب اسلامی فلسفہ حیات کے عنوانوں کے ساتھ میری کتابوں میں شامل ہے۔ تو ان کی انگریزی کی کتاب دگنی ہو کر ''حیات بعد الموت'' کے طور پر انہی دنوں میں شائع ہو گئی۔ جس کے اب چار مزید ایڈیشن بھی شائع ہو چکے ہیں۔ علاوہ ازیں یہ کچھ تو مجھ پر کب کا وارد ہو چکا تھا کہ نہ صرف غیروں کی سازش کے ساتھ ہمارے اندر سے روح محمدی ﷺ نکالی جا رہی ہے بلکہ یہ کچھ کم علمی کی وجہ سے بھی ہو رہا ہے۔ تو کرنل شیخ عبدالرؤف جن کا ذکر پیرا88 میں ہو چکا ہے ان سے مل کر قرآن پاک سے تقریباً اڑھائی سو آیات مبارکہ الگ کیں، جن میں رب سبحانہٗ اپنے حبیبِ پاک صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی شان بیان فرماتا ہے۔ اور ان کی وضاحت کرتے ایک چھوٹی سی کتاب شائع کر دی، جس کا نام ''شان حبیب ﷺ نگاہِ رب العالمین میں'' رکھا۔ لیکن اس کے جو خود پر اثرات ہوئے انہوں نے حیران کر دیا، سوتے جاگتے غیبی آوازیں شروع ہو گئیں کہ یہ سارا قرآن پاک رب سبحانہٗ کے حبیب ﷺ کی شان میں ہے۔ سب قرآن کی تفسیر لکھ۔ ساتھ ہی ایک اور ''اشارہ'' ہوا

کہ پیرا18 میں ذکر ہو چکا ہے کہ کرنل عبدالرؤف صاحب کی جھنجوڑ نے مجھ سے مودودی کی تفہیم پر تبصرہ لکھایا تھا۔ تو اب اشارے شروع ہو گئے کہ اگر مودودی جیسا کم علم تفہیم لکھ سکتا ہے تو تم ایسا کام کیوں نہیں کر سکتے اور بریگیڈیر صدیق ستی تو تمہاری کتاب حضور پاک صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے جلال و جمال کو قرآن پاک کی عملی تفسیر قرار دے چکا ہے۔ جو ذکر پیرا 84 میں ہو چکا ہے۔

136۔ قارئین اس عاجز نے کبھی سوچا بھی نہ تھا کہ میں قرآن پاک کی تفسیر لکھوں گا۔ کہ میرا اس سلسلہ میں علم نہ ہونے کے برابر تھا۔ اور پھر عربی زبان پر بھی زیادہ عبور نہ تھا، لیکن اللہ تعالیٰ کے راز بھی نرالے ہیں۔ بشیر صاحب جن کا اوپر ذکر ہو چکا ہے انہوں نے 2000ء میں سورۃ البقرۃ کی تفسیر لکھی اور مجھے دے گئے کہ میں اس پر نظر ثانی کر کے نظریہ جہاد اور روحانی تصورات کے اضافے کر دوں۔ یہ کام میں نے کر دیا تو بشیر صاحب پڑھ کر حیران ہوئے اور فیصلہ ہوا کہ آئندہ کے لیے میں آگے آگے چلوں گا اور بشیر صاحب پیچھے پیچھے اور اس طرح یہ عاجز قرآن پاک کی تفسیر میں ''داخل'' ہو گیا۔ اس کے بعد بشیر صاحب کو جو اپنوں کی حراست میں رہنا پڑا تو یہ عاجز اس میدان میں ''اکیلا'' رہ گیا۔ سب سے بڑا مسئلہ یہ تھا کہ اس تفسیر کو شائع کون کرے گا؟ تو اندر سے ہی آواز اٹھی کہ تو جو اس کام سے لطف اندوز ہو رہا ہے یہ کچھ تو کسی دولت سے نہیں خرید سکتا۔ تو اپنا کام جاری رکھ اور خوب لطف اٹھا۔ اشاعت جانے اور اشاعت کرانے والے جانیں۔ ہاں یہ عام تفسیر نہیں ہونا چاہیے۔ اول یہ یاد رکھنا کہ سارا قرآن پاک اللہ کے حبیب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی شان کا بیان ہے۔ اس خطہ کے مفسروں

نے اس پہلو کے ساتھ ''انصاف'' نہیں کیا۔ اہل محبت نے پیر کرم شاہ سے کچھ امیدیں ''وابستہ'' کی تھیں، لیکن ان کو مایوس ہونا پڑا۔ تمہاری تفسیر اس سلسلہ میں منفرد ہونا چاہیے۔ دوم قرآن پاک اسلامی فلسفہ حیات پر Running commentary ہے۔ مفسرین نے اس سلسلہ میں تخلیقِ کائنات اور اس کے مقصد انسان، اور انسان کے مقصد معرفت الٰہی کو نہ یک جان کیا ہے نہ بیانات کے رابطے باندھے ہیں۔ اسلامی فلسفہ حیات ہو یا امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا کوئی بیان ہو یا تمثیلی واقعات بیان ہو رہے ہیں، اگر ربطِ آیات سے قرآن پاک سارے کا سارا یا متعلقہ باتوں کے سلسلہ میں پوری طرح قارئین کے سامنے کھل نہیں جاتا تو تمہاری تفسیر بھی تفسیر برائے تفسیر ہوگی۔ اے سپاہی یہ بھی یاد رکھنا کہ اکثر آیات مبارکہ پر واقعات کی صورت میں اسی زمانے میں عمل ہو گیا تھا۔ جس کو تم سیرت النبی ﷺ کے طور پر پڑھ چکے ہو۔ اگر ان واقعات کو آیات مبارکہ سے جوڑا نہ جائے، تو پھر تم آیات مبارکہ کا مفہوم لکھ رہے ہوتے ہو اس کو تفسیر نہیں کہہ سکتے۔ اے سپاہی تم کو عربی زبان پر زیادہ عبور نہیں۔ اس لیے صرف ونحو کے چکر میں نہ پڑنا۔ قرآن پاک کے ترجمہ کو لغوی طور پر بھی کرنا اور ساتھ وضاحتی ترجمہ بھی کر دینا کہ دونوں پہلو قارئین کے سامنے آجائیں۔

137۔ قارئین یہ اشاروں والا معاملہ نہ ختم ہونے والا مضمون ہے۔ اور اب بھی جاری ہے لیکن حیرانگی کی بات یہ ہے کہ ان دنوں قرآنی علوم پر اتنی زیادہ کتابیں اور تحریریں اپنے آپ ''میسر'' ہونا شروع ہو گئیں کہ اس سلسلہ میں بسم اللہ جناب مفتی محمد لطف اللہ صاحب نے کی، جن کا تفصیلی ذکر پیرا

82 میں ہو چکا ہے۔ جناب مفتی صاحب ایک دینی خاندان کے فرزند ہیں۔ اور جنرل احسان الحق ڈار کی طرح علم کے بہت زیادہ پیاسے ہیں۔ لیکن بچپن ہی سے موازنہ کرنے اور خاندانی روایات کی وجہ سے اسلامی علوم کی برتری کے قائل ہیں۔ اور غیروں کی علمیت پر ان کو داد دینے سے ذرا بھر نہیں جھجکتے۔ لیکن ان کا ایمان ہے کہ ہم مسلمان اگر اپنے علم کے خزانوں سے صحیح رہنمائی حاصل کریں، تو غیر یا باطل نظریوں والے ہمارے سامنے بونے نظر آئیں گے۔ بہرحال علم کے سلسلہ میں ہماری اس ہم خیالی نے کافی حد تک ہمیں ''یک نفس'' کر دیا ہے۔ اور اپنے بزرگان میں سے جناب محی الدین ابن عربیؒ کی تحریریں تلاش کرنا ہم دونوں کو ایک دوسرے کے اور نزدیک لے آیا۔ کہ جناب ابن عربیؒ کی کتاب فتوحات مکیہ کی ایک کاپی لے کر جناب لطف اللہ صاحب میرے پاس آئے تو مجھے ایسے لگا کہ جس مقصد کی میں تلاش میں تھا۔ وہ مجھے مل گیا ہے۔ میں نے ان کو گزارش کی کہ میں صرف لطف اٹھانے کے لیے قرآن پاک کی تفسیر میں مصروف ہوں اور جناب ابن عربیؒ کی کتابوں کی شدت سے ضرورت محسوس کر رہا تھا۔ میں نے تفسیر کے چند اوراق انہیں پڑھ کر سنائے تو وہ اور حیران ہوئے کہ یہ تو قرآن پاک سے قرآن پاک کی تفسیر ہے اور وہ ایسی تفسیر کی اشاعت کا کچھ بندوبست کریں گے۔ اب کہانی کو مختصر کرتا ہوں کہ اس کے بعد لطف اللہ صاحب کو قرآنی علوم پر جو کتاب کہیں سے ملی وہ مجھے میسر کی۔ اور جناب ابن عربیؒ کی باقی تصنیفات بھی متعدد ذرائع سے میرے پاس پہنچنا شروع ہو گئیں۔

138۔ اسی دوران یہ عاجز خلفاء راشدینؓ کی کتابوں کا دوسرا اور سول ایڈیشن شائع

کرانے میں کامیاب ہو گیا تھا کہ خلفاء راشدینؓ کے اسلام کا ذکر پیرا 69اور کتابوں کا ذکر پیرا80 میں ہو چکا ہے۔ چنانچہ میں نے ان کتابوں کا ایک Set جناب لطف اللہ صاحب کو پیش کیا تو وہ پڑھ کر حیران ہوئے کہ اس مضمون پر ایسا تحقیقی کام اس سے پہلے ان کی نظر سے نہ گزرا تھا۔ کہ صحابہ کرامؓ اور خاص کر خلفاء راشدینؓ کے اعمال کو قرآن پاک سے اخذ شدہ اور سنت نبوی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے اعمال کے طور پر اسلامی فلسفہ حیات کے تابع اس طرح بیان کیا کہ وہ خود ''چلتے پھرتے اسلام'' تھے۔ تو ان کے درمیان تو کوئی اختلاف نہ ہوتا تھا۔ یہ اختلافات تو بعد کی سیاسی ضرورتیں تھیں یا کم علمی اور ضد کی وجہ سے تھے۔ وہ اس تحقیق سے ایسے متاثر ہوئے کہ انہوں نے اپنا تن من دھن سب کچھ میری تفسیر میں ڈال دیا۔ کہ اس عمر میں میرا تو چلنا پھرنا بھی محدود ہے۔ میں اشاعت کیسے کرا سکتا؟ تو جناب لطف اللہ صاحب میرے مشورہ سے ٹیکسٹ (Text) کی ایڈیٹنگ خود کرتے ہیں۔ اور باقی علماء سے مشورہ کے بعد جہاں شک پڑ جائے وہاں تفسیر کی تصحیح بھی کراتے ہیں۔ کمپوزنگ بھی خود کراتے ہیں۔ اور پھر سب پروف آ کر میری چیکنگ کے لیے میرے گھر بھی چھوڑ جاتے ہیں اور اکثر آ کر انہیں واپس بھی لے جاتے ہیں۔ اب قدرت کے فیصلوں کا اندازہ لگائیں کہ ایک سینئر CSP ریٹائرڈ افسر جنہوں نے ملک کے سب سے بڑے دفاعی تربیتی ادارہ سے NDC کی ڈگری بھی حاصل کی ہوئی ہے اور ان کو کئی کاموں کی پیشکشیں موصول ہوئیں لیکن وہ مکمل طور پر اس تفسیری کام میں داخل ہو چکے ہیں اور اپنے آپ کو اس چھوٹے سے میجر کے ساتھ وابستہ کر دیا ہے۔

139۔ میں نے ساری تفسیر لکھ لی ہے۔ اور تین چار سورتوں کو چھوڑ کر سب کام کمپوز بھی ہو چکا ہے۔ پہلی منزل یعنی پہلے پانچ پاروں کی اشاعت بھی ہو چکی ہے۔ اور اشاعتی خرچ پر اس کی بکری بھی ہو چکی ہے۔ کہ بنیادی خرچ یعنی کمپوزنگ کا خرچ خود لطف اللہ صاحب اپنی جیب سے کر رہے ہیں۔ دوسری اور تیسری منزل اشاعت کے لیے تیار ہیں۔ لیکن باقی کام پر نظر ثانی اور پروف ریڈنگ وغیرہ بہت کام ہے اور قارئین سے گزارش ہے کہ وہ ہمارے لیے دعا کریں کہ اس عمر میں بھی اللہ تعالیٰ سعادت نصیب کر رہا ہے کہ لوگوں کو اللہ تعالیٰ کی نافرمانی سے روک رہے ہیں اور صراط مستقیم کی نشاندہی کر رہے ہیں۔ تفسیر کے بنیادی خرچ کے لئے کرنل شیخ عبدالرؤف، میجر عجائب حسین اور ملک سرفراز نے بھی کچھ مالی امداد کی اور کچھ صاحبان کے نام ظاہر کرنے کی اجازت نہیں۔ اور بریگیڈیئر زبیر چٹھہ، کرنل یوسف، کرنل شیخ عبدالرؤف اور محبوب جیلانی نے متعدد کاپیاں خرید کر آگے تحفہ کے طور پر بانٹیں۔ روحانی طور پر بھی حوصلہ افزائی ہوئی کہ جناب آفتاب طارق اور حافظ شہباز صاحب کو تفسیر کی یہ منزل خواب میں رحمۃ للعالمین صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو پیش کرنے کی سعادت بھی حاصل ہوئی۔ اللہ تعالیٰ کے فضل سے ہماری اس تفسیر کے لیے جو خراج تحسین کے الفاظ موصول ہوئے ان میں سے صرف سید ذاکر حسین شاہ سیالوی جو ٹرپل ایم اے ہیں، اور اسلامی نظریاتی کونسل کے ممبر ہیں، ان کے بیانات سے چند الفاظ یہاں نقل کر رہے ہیں۔

"معلوم ہوتا ہے کہ دانائے سبل صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے امیر افضل کی دستگیری فرمائی جن کا وہ سپاہی ہے۔ کہ شاید ہی کسی تفسیر

میں وہ زور بیان ہو جو اس سپاہی کی تحریر میں ہے کہ دلائل اور مسائل کی گہرائی بالکل منفرد قسم کی ہے۔ ربط آیات کا انداز قاری کو اپنی گرفت میں لے لیتا ہے۔ اور یہ سپاہی سارے عالم انسانیت کو عشق رسول ﷺ کی دعوت دیتا ہے کہ یہ سپاہی از خود عشق مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا حدی خوان ہے"۔

140۔ قارئین کو اس میں ذرا بھر شک نہیں ہونا چاہیے کہ ہماری قوم ایک عذاب میں گرفتار ہے اور اللہ تعالیٰ سبحانہ' اور رسول پاک ﷺ کے ساتھ غداری کی وجہ سے ہم ذلالت کی زندگی گزار رہے ہیں۔ اس عاجز کو اللہ تعالیٰ سعادت دے رہا ہے کہ لگا تار 1948ء سے میں قوم کو بتا رہا ہوں، کہ ہماری یہ زندگی ذلالت والی ہے۔ لیکن یہ نہیں لکھتا کہ نتیجۃً ہم تباہی سے دوچار ہونے والے ہیں یا تباہی سے دوچار ہو جائیں گے۔ کہ میں نہیں چاہتا کہ اس عاجز کے الفاظ "حجت" بن جائیں۔ لیکن اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ ہم تباہی سے یا عذاب سے بچے ہوئے ہیں۔ میں نے کوئی لگی لپٹی نہیں رکھی کہ آزادی کے وقت ستر ہزار نوجوان عورتیں کفار کے پاس چھوڑ آئے اور 1971ء میں نوے ہزار فوجیوں سے ہتھیار ڈلوائے۔ اور ملک کا ہر سربراہ عبرتناک انجام سے دوچار ہوا ہے۔ اور اکثر بارشیں بروقت نہ ہوئیں۔ سیلاب آئے اور حادثے ہوتے رہے اور کئی طرح سے ہم عذابوں سے دوچار ہوتے رہے۔ لیکن نہ کبھی اجتماعی طور پر توبہ وندامت کی، نہ یہ جاننے کی کوشش کی کہ ہم ان عذابوں سے کیوں دوچار ہوئے ہیں یا ہو رہے ہیں۔ اور اللہ تعالیٰ کی نافرمانی کی بات تو کبھی کسی نے نہ سوچی اور نہ کبھی اخباروں میں کسی صاحب نے ذکر کیا۔ اس سلسلہ میں کھل کر تو یہ عاجز اکیلا اس

''میدان'' میں ہے کہ تبلیغی خط پر خط لکھ رہا ہے۔ لیکن میرے بیان شدہ صراطِ مستقیم کی طرف یعنی اسلامی فلسفہ حیات کو اپنانے یا اس کو سمجھنے کی طرف کوئی پیش رفت نہ ہوئی۔

141۔ لیکن اب جو صورت عذاب نے اختیار کر لی ہے۔ تو ہم نے اگر اس کی وجوہات کو سمجھنے کی کوشش نہ کی تو ہم مٹ سکتے ہیں یا ملیا میٹ ہو سکتے ہیں (توبہ میرے اللہ) یہ عاجز اس سلسلہ میں بھی بہت کچھ لکھ چکا ہے کہ پاکستان اللہ تعالیٰ کا ایک بہت بڑا راز ہے۔ اور اسلام کی نشاۃ ثانیہ کی بسم اللہ ہے۔ اس لئے سورۃ البقرہ کی آیت مبارکہ 243 کے مطابق ہم جتنی بھی مردہ حالت (یعنی ذلت کی زندگی) میں چلے جائیں اللہ تعالیٰ ہمیں دوبارہ زندہ حالت (یعنی غیرت کی زندگی) میں ضرور کرے گا۔ اول موجودہ صورت حال کو سوچیں کہ یہ اتنا بڑا المیہ ہے کہ ہماری موجودہ حکومتیں یا تنظیمیں یا معاشرتی صورت حال یا ادارے اس پر قابو نہیں پا سکتے کہ تباہی کا پھیلاؤ اتنا زیادہ اور ایسے علاقوں میں ہے کہ ہمارے پاس ذرائع ہی نہیں کہ ہم متاثرہ لوگوں کو ان کے علاقوں میں آباد کر سکیں۔ اور کافی لوگ اب وہاں آباد ہونا پسند بھی نہ کریں گے۔ اور دور دراز یہ خیمہ بستیاں کتنے دن چل سکیں گی۔ ہمارے پاس اور بھی کوئی جگہ نہیں جہاں ان لوگوں کو آباد کیا جائے۔ پھر کافی تعداد ناکارہ اور بے سہارا لوگوں کی ہے۔ حکومت کب تک ان کا خرچ برداشت کرے گی۔ پھر فطرت کا بھی کوئی پروگرام ہوگا کہ اس نے ہمیں اتنے بڑے عذاب یا تباہی سے دوچار کر دیا کہ ہم عبرت پکڑیں کہ کہا جاتا ہے آخر زمانہ ہے اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام اور امام مہدیؓ کے ظہور میں زیادہ دیر نہیں۔ خیر میرے لحاظ سے ان بزرگوں کی آمد ہمارے

معاملات کا حل ہرگز نہیں۔ وہ تو قرآن پاک کی سورۃ الزخرف کے مطابق قیامت کا علم یا نشانیاں ہیں۔ ہمارے لیے البتہ اس میں یہ انکشاف ہے کہ غزوات الہند نے امام مہدیؑ کے ظہور سے پہلے تکمیل پانا ہے۔ اور اس کے لیے عشق بلا خیز کے قافلہ سخت جان کا ہونا ضروری ہے۔

142۔ حضور پاک صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے زمانے میں زلزلہ کا جھٹکا محسوس ہوا، تو آپ ﷺ نے زمین پر اپنا ہاتھ مبارک رکھ کر فرمایا۔ ''اے زمین تو ساکن ہو جا'' پھر لوگوں کی طرف متوجہ ہو کر فرمایا'' تمہارا رب چاہتا ہے کہ تم اپنی خطاؤں کی معافی مانگو۔'' اس کے بعد زلزلہ کے جھٹکے رک گئے۔ اب یہ زبانی کلامی معافی نہیں ہوتی جو اخباروں میں روزانہ کسی عالم کا بیان آ جاتا ہے۔ سوال یہ ہے کہ ہمیں معلوم کرنا چاہیے کہ ہم اللہ تعالیٰ کی کیا نافرمانی کر رہے ہیں اور میرے لحاظ سے یہ نافرمانی یہ ہے کہ ہم نے اللہ تعالیٰ کے دیئے ہوئے نظام کی بجائے کافرانہ سیاسی نظام اپنائے ہوئے ہیں۔ اس سے توبہ کرنا چاہیے۔ لیکن ہمارے دانشوری کا لبادہ اوڑھنے والا مجید نظامی کہتا ہے کہ اس زلزلہ کی تباہی سے نپٹنے کے لیے کافرانہ سیاسی نظام کے بڑے کرتا دھرتاؤں غدار کی مکار بیٹی اور ''کچی بچی'' بے نظیر اور ''کچے وچھے'' نواز شریف کو بلایا جائے۔ اب سب لوگ بے نظیر کو جانتے ہیں کہ وہ اسلامی سزاؤں کو ظالمانہ عمل قرار دے چکی ہے۔ اور نواز شریف کے ''جنسی سیکنڈلوں'' سے پوری قوم آگاہ ہے۔ پھر کونسی ندامت اور کیسی ندامت؟ غزوات الہند کے بارے بھی یہ وضاحت ضروری ہے کہ غزوہ اس کو تسلیم کیا جاتا ہے، جس میں ہمارے آقا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم خود شرکت فرما رہے ہوں۔ اور خیر ویسے تو آپ ﷺ ہر وقت ہر جگہ تشریف فرما ہیں کہ سورۃ الحجر کی آیت مبارکہ

88اور سورۃ الشعرا کی آیت مبارکہ 215 کے مطابق آپ ﷺ کی رحمت کے بازو مومنین کے لیے ہر وقت کھلے ہیں۔ ملکِ پاکستان ربِ ذوالجلال نے ہمیں عطیہ کے طور پر دیا کہ یہاں پر مصطفے ﷺ جانِ رحمت پہ لاکھوں سلام کی صدا بلند ہوئی اور متعدد غازی ناموسِ رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر قربان ہو گئے۔ یہ کچھ غزوات الہند کے لئے پیش خیمہ تھا۔ اس عاجز نے اپنی 58 سالہ ذلت کی زندگی پر بھر پور تبصرہ کر دیا ہے، اور صورتِ حال کی ساری نقشہ کشی کر دی ہے۔ اور اب قافلۂ سخت جان کے ظاہر ہونے کا وقت قریب آ گیا ہے۔ اس لئے غزوات الہند کا قافلہ سخت جان، مومنین اور غلاموں کا قافلہ ہو گا۔ اس میں مودودی جیسے بے ادب لوگوں کے پیروکاروں یا مفتی محمود کے پیروکاروں کی کوئی جگہ نہیں۔ جس کے مطابق پاکستان کا وجود میں آ جانا ایک گناہ ہے۔ تو بے دین سیاستدانوں کی بات تو الگ رہی، ہمارے آج کل کے مولوی جو ہمارے رہنما بنے ہوئے ہیں، ان کی بھی عشق بلا خیز کے قافلہ سخت جان میں کوئی جگہ نہیں۔

143۔ قارئین پاکستان بنانے کا یہ مقصد ہرگز نہ تھا کہ کافرانہ سیاسی نظام اپنا کر ہم ایک حزب اقتدار بنائیں گے اور ایک حزب اختلاف۔ جو مخالفت برائے مخالفت کر کے اپنا بھی وقت ضائع کریں گے اور قوم کا وقت بھی۔ ہم نے تو جہاد کو طرز زندگی کے طور پر اپنا کر حزب اللہ (اللہ تعالیٰ کی فوج) بننا تھا۔ اگر ان کافرانہ نظاموں سے توبہ کر کے اسلامی فلسفہ حیات کے تابع اس ملک میں اسلامی نظام کا نفاذ کر کے اس پر عمل نہیں کرتے تو یہ عذابوں اور تباہی والا معاملہ ختم نہ ہو گا۔ اور ایسی ''بھیانک'' صورت حال ہو سکتی ہے کہ کھرا اور کھوٹا بالکل الگ الگ نکھر جائیں گے۔ اس سلسلہ میں یہ عاجز ایسی

صورت حال کی تصویر نہ پیش کرے گا کہ میرے الفاظ ''حجت'' نہ بن جائیں۔ اور ایک دفعہ پورے ملک کی اینٹ سے اینٹ نہ بج جائے۔ توبہ میرے اللہ۔ رب نبی محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم، آپ نے مجھے دعا اپنے گھر میں القا فرمائی اس کو ادا کر کے مضمون کو ختم کرتا ہوں۔

''کہ تو مقلب القلوب ہے۔ ہمارے دلوں کو پھیر دے کہ ہمیں غیرت اور عزت کی زندگی حاصل ہو جائے۔ کہ ہم حضور پاک صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے جمال سے اس خطہ کو معطر، منور اور مطہر کر دیں اور حضور پاک ﷺ کے جلال سے غیرت حاصل کر کے جہاد کو طرز زندگی کے طور پر اپنا کر تیری فوج بن جائیں'' آمین ثم آمین۔

144۔ احباب میں دن بدن اضافہ ہو رہا ہے۔ اور اللہ تعالیٰ مجھے اور میرے رفقاء کو یہ سعادت دے رہا ہے کہ ہم حضور پاک صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی محبت کو لوگوں میں تقسیم کرتے رہیں۔ اور بے شمار محبّ صاحبان ہمارے ساتھ رابطہ میں ہیں۔ چند سالوں سے برگیڈیئر زبیر چٹھہ اور ان کی بیگم صاحبہ بیٹی راشدہ کے ان میں اضافہ سے ہر ربیع الاول میں یوم میلا دالنبی ﷺ کا ایک بڑا اجتماع کرنے کی سعادت اس گھر کو حاصل ہو رہی ہے۔ اور محبان رسول ﷺ کے درمیان رابطے بہتر ہو رہے ہیں۔ اور ملک کے عظیم دانشور پروفیسر کے ایم اعظم کموڈور طارق مجید وغیرہ جب راولپنڈی آئیں تو لمبی ملاقات کرنے آتے ہیں۔ اور لاہور سے ڈاکٹر محمد اشرف، محبوب جیلانی اور محمد طفیل وغیرہ متعدد صاحبان صرف ملاقات کی غرض سے راولپنڈی تشریف لائے۔ اور پچھلے دنوں ایک پوری رات اس تاثر میں گذر گئی کہ

مجھے اور میرے متعدد رفقاء کو حضور پاک صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی رحمت تقسیم کرنے کی سعادت نصیب ہو رہی ہے۔ جب آنکھ کھلتی تھی تو نیند میں دوبارہ وہی سعادت شروع ہو جاتی تھی اور اس سلسلہ میں اپنے بے شمار رفقاء کو خوابوں میں دیکھا۔ کسی کو ان کے گھروں میں، کسی کو ان کے دفتر میں اور کسی کو اپنے ساتھ چلتے دیکھا۔ اور پورے مناظر کے بیانات کے لئے کئی صفحات لکھنے کی ضرورت ہے۔ بعد میں یہ بھی باور کرایا گیا کہ رحمت کا مطلب محبت ہے اور یہ دوطرفہ عمل ہے۔ ساتھ درود شریف کثرت سے پڑھنے کی تاکید بھی ہوتی رہی۔ اور اس مضمون کو علامہ اقبال کے اس شعر سے اختتام تک پہنچائیں؛ ؎

کی محمد ﷺ سے وفا تو نے تو ہم تیرے ہیں
یہ جہاں چیز ہے کیا لوح و قلم تیرے ہیں

ناشر: میجر (ریٹائرڈ) امیر افضل خان (حضور پاک ﷺ کا سپاہی)
۱۹۔ ذی شان کالونی، قاب لائنز، راولپنڈی۔
فون: 051-5583778
اشاعت: جنوری 2006ء
ہدیہ: **30** روپے

مُصنف کی دیگر کتب

میجر صاحب نے یوں تو تقریباً بیس کتابیں لکھی ہیں مگر ان میں سے مندرجہ ذیل کتب خصوصی توجہ کے لائق ہیں کیونکہ ان کتب میں میجر صاحب نے سرکار ہر عالم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم اور آپ کے صحابہ رضوان اللہ تعالیٰ عنہم کی شان جس انداز میں بیان کی ہے شائد کوئی اور مصنف یہ انداز تحریر نہ اختیار نہیں کر سکا۔

1- حضور پاک صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کا جلال و جمال:۔

اس کتاب میں حضور پاک ﷺ کے جلال و جمال کو انتہائی دلنشین انداز میں بیان کیا گیا ہے۔ خصوصی طور پر حضور پاک ﷺ کی ظاہرہ زندگی مبارکہ کی مصروفیات کا تذکرہ ایسے انداز میں ہے کہ اس سے قبل یہ انداز بیان کسی نے نہیں اپنایا اسی لئے ملک کی مشہور و معروف شخصیتوں کو بھی یہ تسلیم کرنا پڑا کہ میجر صاحب نے جو بیان فرمایا ہے ہم آج تک اس طرف سوچ بھی نہ سکے گویا کہ اب تک لکیر کے فقیر بنے رہے تحقیق کی طرف دھیان ہی نہ گیا۔

2- خلفائے راشدین کی جنگی حکمت عملی اور تدبیرات کے جائزے:

اگرچہ مصنف نے جرمن جنگی ماہر کلاسوٹز کی آٹھ کتب کا ترجمہ بھی کیا ہے مگر یہ کتاب چار جلدوں میں ایک ایسا ریکارڈ ہے کہ جس کا کوئی جواب نہیں کیونکہ مصنف نے ان کتب میں ثابت کیا ہے کہ مسلمانوں کے پاس دوسرے تمام مذاہب سے بہترین فلسفہ جنگ موجود ہے مگر افسوس کہ ہم گھر کو چھوڑ کر دوسروں کی پیروی کر کے ذلیل و خوار ہو رہے ہیں۔

قرآن پاک

کی معیاری طباعت کا مرکز

علم دین پبلشرز